ISSN: 2321-8339
اپریل - جون ۲۰۱۷ء
ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان
سہ ماہی
تحقیقاتِ اسلامی
علی گڑھ
اسلام کا عائلی نظام۔ رحمت ہی رحمت
سید جلال الدین عمری
مکی دور کی احادیث سیرت ابن اسحاق میں (۲)
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
سیاستِ شرعیہ: مفہوم، مقصد اور دائرۂ کار
مولانا محمد جرجیس کریمی
نظریۂ وحدت ادیان کا جائزہ
محترمہ رمیصاء مریم
ابن فورک اور ان کی تصنیف 'مشکل الحدیث'
حافظ نصیر احمد
تعارف و تبصرہ

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۶ شمارہ: ۲

رجب ــــــــــ رمضان ۱۴۳۸ھ

اپریل ــــــــــ جون ۲۰۱۷ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کردیے گئے ہیں۔
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

موبائل: 09897746586

ای میل idaratahqeeq2016@gmail.com :

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ ۴۰ روپے

سالانہ ۱۵۰ روپے

پانچ سال کے لیے ۶۰۰ روپے

سالانہ (لائبریریاں و ادارے) ۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی) ۲۰ /امریکی ڈالر

سالانہ (ادارے) ۲۵ /امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی) ۲۵ /امریکی ڈالر

سالانہ (ادارے) ۳۰ /امریکی ڈالر

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی ــ ۶ سے چھپوا کر

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، نئی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

تحقیق و تنقید

بحث و نظر

سیر و سوانح

تعارف و تبصرہ

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سابق چیرمین، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

mnz-comp@yahoo.in

۲۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

jarjees.karimi@yahoo.com

۳۔ رمیصاء مریم

ریسرچ اسکالر، یونی ورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ سائنس، لاہور (پاکستان)

romesamariam@yahoo.com

۴۔ حافظ نصیر احمد

لیکچرر، اسلامک اسٹڈیز، گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور (پاکستان)

hafiznaseer6@gmail.com

۵۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

mrnadvi@gmail.com

۶۔ جناب عبدالحی اثری

F-۱۳۵، شاہین باغ، جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

makkiabdulhai@gmail.com

۷۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

اسلام کا عائلی نظام

رحمت ہی رحمت

__________ سید جلال الدین عمری

جماعت اسلامی ہند نے مسلمانوں میں اسلامی شریعت کے سلسلے میں بیداری لانے کے لیے ملک گیر سطح پر 'مسلم پرسنل لا بیداری مہم' [۲۳/اپریل تا ۷/مئی ۲۰۱۷ئ] کا انعقاد کیا۔ الحمدللہ اس مہم کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مہم کے دوران، حیدرآباد، چنئی، کولکاتہ اور دہلی میں امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا سید جلال الدین عمری کے خطابات ہوئے۔ مؤرخہ ۲۶/اپریل ۲۰۱۷ء کو انھوں نے چنئی میں جو تقریر کی تھی، اسے افادۂ عام کے لیے موصوف کی نظرثانی کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ (رضی الاسلام)

اسلام کے عائلی نظام کو ہم 'مسلم پرسنل لا' کہتے ہیں۔ اس میں نکاح، طلاق، خلع، نان و نفقہ، وراثت، وصیت، رضاعت اور حضانت وغیرہ شامل ہیں۔ حضانت کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی الگ ہوگئے تو بچوں کی پرورش کون کرے گا؟ بچے اگر چھوٹے ہیں تو ان کی پرورش کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس طرح کے بہت سے مسائل اس کے اندر آتے ہیں۔ اس کا تعلق میاں بیوی سے بھی ہے، ماں باپ سے بھی اور اولاد سے بھی، بھائی بہن سے بھی ہے اور دوسرے رشتہ داروں سے بھی۔ سب کے حقوق اور ذمہ داریاں قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ میاں بیوی

کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے کیا حقوق ہیں؟ ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ رشتے داروں کے کیا حقوق ہیں؟ ان کے درمیان کیا تعلق ہے؟ میاں بیوی کا تعلق اصل میں محبت و الفت کا تعلق ہے۔ اسی لیے اس کا جوڑا بھی اسی سے بنایا گیا ہے۔ اس کے جذبات بھی ٹھیک اسی طرح کے ہیں۔ اللہ تعالی نے کہیں ایسا نہیں کیا ہے کہ کسی دوسری مخلوق کو انسان کا جوڑا بنا دیا ہو۔

شریعت کے ان احکام کا تعلق، خواہ میاں بیوی سے ہو یا ماں باپ سے، اولاد سے ہو یا بھائی بہن سے یا دوسرے قریبی رشتہ داروں سے، ان کے سلسلے میں قرآن میں بہت تفصیل آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی وضاحت کر دی ہے۔ اس وقت سے اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ ان پر عمل نہ ہوا ہو۔ جب نماز فرض ہوئی، روزہ فرض ہوا، زکوٰۃ کے احکام آئے، حج کے احکام آئے، اس وقت سے مسلسل آج تک ہر آدمی ان پر عمل کر رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پرسنل لا پر بھی عمل ہوتا رہا ہے۔

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پرسنل لا کا مسئلہ میاں بیوی کا انفرادی مسئلہ ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ مسئلہ پورے خاندان سے متعلق ہے۔ قرآن و حدیث نے نماز روزے کی طرح ان کی بھی پابندی کا حکم دیا ہے۔ جب سے یہ احکام آئے ہیں، کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے کہ اس پر عمل نہ ہوا ہو۔ اس پر عمل اس وقت بھی ہوا ہے جب مسلمان اقتدار میں تھے اور اس وقت بھی اس پر عمل ہوا جب وہ اقتدار میں نہیں تھے۔ اس پر عمل عرب میں بھی ہوا اور جب مسلمانوں کی حکومت عرب سے باہر قائم ہوئی وہاں بھی ہوا۔ عراق میں ہوا، مصر اور شام میں ہوا، فلسطین میں ہوا، بلکہ ساری دنیا میں ہوا۔ آج بھی اس پر ان ممالک میں عمل ہو رہا ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان ممالک میں بھی ہو رہا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں، جیسے ہندوستان یا وہ مغربی ممالک جہاں وہ دو چار فیصد ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم یہاں دو فیصد ہیں، اس لیے نماز نہیں پڑھیں گے، یا روزے نہیں رکھیں گے، یا اس میں

ترمیم کریں گے۔ گرمی کا موسم ہے تو روزے دوسرے مہینے میں رکھ لیں گے۔ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے، نہیں دیں گے۔ اس طرح کی باتیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ مسلمان کہیں بھی رہے اور کسی بھی حال میں رہے، اقتدار میں رہے یا اقتدار کے باہر رہے، وہ ان عائلی احکام کا پابند ہے۔ ان کی اسی طرح تاکید کی گئی ہے، جس طرح نماز روزے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں عائلی احکام بیان کیے گئے ہیں، کہا گیا ہے کہ یہ حدیں ہیں، ایک مسلمان کو ان کے اندر رہنا ہوگا، ان سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ ایک جگہ تقسیمِ وراثت کے اصول بیان ہوئے ہیں، اس کے آگے فرمایا:

تِلْکَ حُدُودُ اللّٰہِ وَمَن یُطِعِ اللّٰہَ وَرَسُولَہُ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِن تَحْتِہَا الأَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْم

(النسائ:۱۳)

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کام یابی ہے۔

انسان کے لیے اس سے بڑی کام یابی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب وہ اس دنیا سے جائے تو ہمیشہ جنت میں رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَمَن یَعْصِ اللّٰہَ وَرَسُولَہُ وَیَتَعَدَّ حُدُودَہُ یُدْخِلْہُ نَاراً خَالِداً فِیْہَا وَلَہُ عَذَابٌ مُّہِیْن (النساء:۱۴)

اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی گئی حدوں سے تجاوز کرے گا، اسے اللہ جہنم کی آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔

یہاں وراثت کا قانون بیان ہوا ہے۔ اللہ نے اس کے حدود بیان کردیے ہیں۔ جو شخص ان سے آگے بڑھے گا یا ان میں ترمیم کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ڈال دے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ سزا اس شخص کے لیے ہے، جو احکامِ الٰہی کا منکر ہے۔ جو شخص ان احکام کو اللہ کی طرف

سے مانتا ہے، لیکن عملاً کوتاہی کرتا ہے، اسے سزا کے بعد جہنم سے نکال دیا جائے گا، اس کے لیے ابدی جہنم نہیں ہے۔ ایک جگہ احکامِ طلاق کے بعد فرمایا:

تِلْکَ حُدُودُ اللّٰہِ فَلاَ تَعْتَدُوھَا وَمَن یَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰہِ فَأُوْلٰـئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُون (البقرۃ:۲۲۹)

یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے طلاق کا طریقہ بیان کر دیا ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اس کی قائم کردہ حد ہے۔ جو اللہ کی حد کو توڑے گا، وہ دوسرے کو کیا نقصان پہنچائے گا؟ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ آدمی سوچتا ہے کہ اس نے بیوی کا حق نہیں دیا، رشتہ داروں کا حق مارلیا، بچوں کا حق مارلیا، بھائی بہن کا حق مارلیا تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! دوسروں کی تباہی ہوئی ہے یا نہیں، یہ بعد میں دیکھیں گے، یادرکھو سب سے پہلے تم خود تباہ ہو گئے۔

جن قوموں نے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی، اللہ نے ان کا بڑا سخت حساب لیا اور وہ تباہ کر دی گئیں۔اس لیے کوئی قوم یہ نہ سوچے کہ ہم اللہ کی نافرمانی کرکے اس کے عذاب سے بچ جائیں گے۔سورۂ طلاق میں بات ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَکَأَیِّن مِّن قَرْیَۃٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّھَا وَرُسُلِہِ فَحَاسَبْنٰھَا حِسَاباً شَدِیْداً وَعَذَّبْنٰھَا عَذَاباً نُّکْراً۔فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِھَا وَکَانَ عَاقِبَۃُ أَمْرِھَا خُسْراً (الطلاق:۷۔۸)

کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انھوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجامِ کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

اس لیے کوئی قوم اور کوئی آبادی یہ نہ سمجھے کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کرکے وہ بچ جائے گی۔ یہ تنبیہ اسی لیے کی گئی کہ ان احکام کی پابندی آدمی اسی طرح کرے جس

طرح ان کا پابند کیا گیا ہے۔لوگوں کو آج کل نماز روزے کی پابندی تو بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے،لیکن دوسرے احکام کے بارے میں وہ سمجھتے ہیں کہ ان پر عمل کے معاملے میں وہ آزاد ہیں۔ کہا گیا کہ نہیں،قومیں تباہ ہوچکی ہیں اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے، اس لیے اگر تم دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو اللہ کے احکام کے پابند رہو۔یہ احکام پوری تفصیلات کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

اس ملک میں مسلمانوں کے بہت سارے مسائل ہیں۔ان کا سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ یہاں ان کی جان مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے، فسادات نہ ہوں۔ یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر فسادات ہورہے ہیں اور مسلمانوں کی جانیں لی جارہی ہیں۔ایسے ایسے مسائل میں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا جارہا ہے جن کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔وہ برسوں جیل میں پڑے رہتے ہیں، تب پتہ چلتا ہے کہ وہ بے گناہ تھے۔کوئی نوجوان بیس برس کی عمر میں جیل گیا، پھر دس بارہ برس بعد کہا جاتا ہے کہ یہ تو بے گناہ تھا۔اس کی تعلیم ختم ہوگئی، اس کا کیریر ختم ہوگیا، آئندہ تعلیم جاری رکھنا اس کے لیے مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ سے پورے گھر والے پریشان ہوگئے۔ ماں باپ پریشان ہوئے، بیوی بچے پریشان ہوئے۔ اس طرح کے اور بھی بے شمار مسائل ہیں۔سچر کمیٹی نے بتایا ہے کہ مسلمان بہت سے معاملات میں دلتوں کے برابر آگئے ہیں۔مسلمانوں کی معاشی صورت حال بہت خراب ہے۔تعلیم کے لحاظ سے وہ دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ معاشی اور تعلیمی پہلو سے بھی وہ سب سے پچھلی صف میں ہیں۔نوکریوں میں بھی ان کا اوسط برائے نام ہے۔ریزرویشن کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہنگامہ کیا جاتا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ اقلیتوں کے لیے ابھی تلنگانہ میں بارہ فیصد کا مطالبہ کیا گیا تو ہنگامہ ہوگیا۔ایسے ہی تمل ناڈو میں برائے نام ریزرویشن ہے،اس پر بھی ہنگامہ ہورہا ہے۔کرناٹک میں ریزرویشن ہے تو اس کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں۔ان سب کو چھوڑ کر کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا پر عمل کررہے ہیں، اس لیے وہ پیچھے ہیں۔

یہ بات پوری قوت کے ساتھ سامنے آنی چاہیے کہ مسلمان یہاں تعلیم میں، معیشت میں اور دوسرے میدانوں میں پیچھے رہ جائیں گے تو یہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے کہا جا رہا ہے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا سے چمٹے ہوئے ہیں، اس لیے پیچھے ہیں۔ اگر یہ پرسنل پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو گویا آگے ہو جائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا کچھ دین تو مسجدوں میں ہے اور کچھ گھروں میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ گھروں سے بھی نکل جائے۔ اگر ہمارے بچے یہ سمجھ لیں کہ یہ دین باپ دادا تک تھا، اب اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے، تو پھر یہ دین ختم ہو جائے گا۔ آپ کی کوئی پہچان نہیں رہے گی۔ آپ کی شادی دوسرے لوگوں کی طرح ہو گی اور میاں بیوی میں جدائی بھی اسی طرح ہوگی اور آپ کی وراثت بھی اسی طرح سے تقسیم ہونے لگے گی۔ پھر آپ کی کوئی پہچان ہی نہیں رہے گی۔ ساری دنیا میں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو ہر طرح سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ حکومت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ رہے اور وہ اقتدار میں ہوں تو ہمارے اشارے پر چلتے رہیں۔ اس میں وہ کام یاب ہیں۔ انھیں پریشانی ہے کہ مسجد سے اور گھر سے ان کا دین نہیں نکل رہا ہے۔ وہ اسے نکالنا چاہتے ہیں۔ بس اس کوشش میں یہ سارے لوگ لگے ہوئے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس کو نکالنے کے بعد آپ کی کوئی پہچان نہیں رہے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاں نکاح کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن کورٹ یہ کہتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک ساتھ رہ رہے ہیں تو یہ شادی شدہ ہیں۔ ان کا ساتھ رہنا ان کی نظر میں شادی شدہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ 'لومیرج' کے نام پر یا کسی اور نام پر اگر دونوں ساتھ رہ رہے ہیں تو وہ شادی شدہ ہیں۔ اس سے جو اولاد ہوگی وہ بھی صحیح اولاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ نکاح نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اگر اسلام کا نظامِ خاندان ختم ہوا تو پھر اس ملک میں ہماری کوئی پہچان باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے اور دنیا کو بھی بتانا چاہیے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ان کا مذہبی تشخص ختم ہو جائے گا۔

طلاق کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں لاکھوں میں کوئی ایک واقعہ طلاق کا ہوتا ہے۔ وہ غلط ہے یا صحیح ہے؟ اس کا فیصلہ تو مسلمان کریں گے۔ مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا پر ہر دور میں عمل کیا ہے۔ انگریزوں کے دور میں بھی یہاں مسلمانوں کے پرسنل لا پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا، جس میں کہا گیا کہ اگر دونوں فریق (یعنی مقدمہ دائر کرنے والے) مسلمان ہیں تو ان کے درمیان شریعت کے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اگر اس میں کہیں کوتاہی ہوتی تھی تو بتایا جاتا تھا کہ اس میں ہمارا قانون یہ ہے، چنانچہ اس کے مطابق اصلاح ہوجاتی تھی ۔ یہی بات ہمارے دستور میں بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یہاں کے ہر گروہ کو اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ نہ صرف اس پر عمل کر سکتے ہیں، بلکہ اسے پھیلا بھی سکتے ہیں، اس کی تبلیغ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تمام حقوق یہاں کے دستور نے دیے ہیں۔

اگر کوئی مسلمان اپنے پرسنل لا پر عمل کرتا ہے تو وہ کوئی خلافِ دستور کام نہیں کرتا، بلکہ اسی دستور کے اندر رہ کر کام کرتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا ایک دستور ہے۔ مسلمانوں نے یہ نیا دستور کہاں سے نکال لیا؟ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کوئی دستور نہیں نکالا، بلکہ ملک کے دستور نے جو حق انھیں دیا ہے اس پر عمل کر رہے ہیں۔ ملک کے دستور نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہاں کی ہر کمیونٹی کو اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کا حق ہے۔ ہم اس پر عمل کر رہے ہیں۔ اس کے خلاف اگر جائیں تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی دوسرا قانون ہم بنا رہے ہیں۔ یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے اور پورے زور اور قوت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

بہت سے غیر مسلم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں ہیں تو دستوری لحاظ سے انہیں اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کا حق ہے، لیکن ان کو سوچنا چاہیے کہ آج کے دور میں ان کا پرسنل لا نہیں چل سکتا۔ اس میں بڑی ناانصافیاں ہیں۔ عورت کو اس کا حق نہیں دیا گیا ہے اور مرد کو زیادہ دیا گیا ہے۔ وراثت میں بھائی کا حصہ زیادہ ہے اور بہن کا حصہ

کم ہے، یا شوہر کا زیادہ اور بیوی کا کم ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو خود سوچ کر اپنے پرسنل لا میں ترمیم کر لینی چاہیے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا: ایک مسلمان نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اب وہ کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟ کیسے زندگی گزارے گی؟ میں نے کہا: میں ایک سوال کرتا ہوں، اس کا جواب دیجیے۔ میاں بیوی میں بڑی محبت تھی، دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے تھے، کوئی پریشانی نہیں تھی، لیکن معلوم ہوا کہ اچانک شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، یا ہارٹ اٹیک ہو گیا، اب عورت کہاں جائے گی؟ انھوں نے کہا کہ یہ تو دوسرا مسئلہ ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں، میرے سوال کا جواب دیجیے۔ طلاق سے عورت الگ جا ہوتی ہے، اس طرح بھی تو وہ الگ ہوئی۔ مسلمان ان احکام پر چودہ سو سال سے عمل کر رہے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال صرف آج ہی نہیں پیش آ رہی ہے، اس سے پہلے بھی تو آتی رہی ہے۔ میں نے کہا کہ فرض کیجئے، ایک عورت کے ساتھ اس طرح کا حادثہ پیش آیا، شوہر نے اسے طلاق دے دی، یا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ مر گیا، اب دو صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ عورت سروس میں ہے، کما رہی ہے، ٹیچر یا لکچرر ہے، یا کوئی اور کام کر رہی ہے، اس کے پاس کوئی پیشہ ہے، یا باپ دادا کی پراپرٹی ہے، وراثت میں اسے دکان یا مکان ملا ہے، یا کسی انڈسٹری میں اس کا شیئر ہے، جس سے اس کی آمدنی ہو رہی ہے، یا اس کی کوئی کھیتی باڑی ہے، جس کے ذریعہ سے آمدنی ہو رہی ہے، تب تو گویا اس کا مسئلہ حل ہو گیا، اس کے لیے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جائے گی؟ ہر مہینے اسے ایک لاکھ روپے مل رہے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کی شادی ہو جائے، آپ تو جوان عورت کی بات کر رہے ہیں! ہمارے ہاں بیوہ کی شادی آسانی سے نہیں ہوتی۔ یہ غلط کام ہے۔ جس کی طلاق ہو گئی اس کی بھی شادی نہیں ہوتی، یہ بھی غلط کام ہے۔ فرض کیجئے، وہ شادی کے لیے تیار ہو گئی، اس کی شادی ہو گئی، تو اس کا مسئلہ کا بھی حل ہو گیا۔ شوہر اس کی تمام ضروریات پوری کرے گا۔ دنیا میں ایسا بہت کم ہوگا کہ عورت کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو پھر وہ اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے گی۔ وہ اس

کے کھانے پینے کا انتظام کریں گے، اس کی شادی بھی کرائیں گے۔

آج مسلم معاشرے کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ نہ انہیں دین کا علم ہے نہ دنیا کا۔ شہروں میں تو شاید کچھ حالت بہتر ہے، لیکن دیہاتوں میں مسلمانوں کو دیکھ کر یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کسی بھی چیز کا انھیں علم نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ کلمۂ طیبہ کے معنیٰ ومفہوم سے بھی واقف نہیں ہیں۔ بس عید اور بقرعید میں وہ لوگ اپنے مسلمان ہونے کا کچھ مظاہرہ کردیتے ہیں۔

اس صورت حال میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرائیں اور ان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے واقف کرائیں۔ والدین، بچوں، اعزاء و اقارب کے حقوق سے بھی واقف کرائیں اور انھیں ان باتوں پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کریں۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی قرآن کریم میں بہت تاکید آئی ہے۔ انسان جب بڑا ہوجاتا ہے تو وہ اپنے والدین کی شفقتوں اور محبتوں کو بھلا دیتا ہے کہ انھوں نے اسے کتنی مصیبتوں اور مشقتوں سے پالا پوسا ہے۔ وہ تو بس اپنے بیوی بچوں میں مست رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے متنبہ کیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اگر والدین بوڑھے ہوجائیں تو ان کے ساتھ بہترین سلوک کرو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَبِالْوَالِدَیْ ☐ نِ إِحْسَاناً إِمَّا یَبْلُغَنَّ عِندَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ کِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً کَرِیْماً۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْراً (الاسرائ:۲۳۔ ۲۴)

اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم

کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ شخص ناکام ونامراد ہوا جسے اس کے ماں باپ یا ان دونوں میں سے کوئی ایک ملا اور پھر بھی وہ اپنی مغفرت نہ کروا سکا۔“ (مسلم) اللہ تعالیٰ نے والدین کی خدمت کر کے اسے جنت میں جانے کا موقع دیا، لیکن اس نے اس موقع کو کھودیا۔ اس سے بڑا نامراد شخص کون ہوسکتا ہے؟

سماج اور معاشرے میں بہت سے لوگ والدین کی نافرمانی کرتے ہیں یا انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انھیں بھی اس معاملے پر تنبیہ کی جائے اور والدین کی اہمیت کو سمجھایا جائے۔ ایک صحابیؓ رسول نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا: میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ انھوں نے پوچھا: اس کے بعد؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ تیسری مرتبہ انھوں نے پھر پوچھا: اس کے بعد؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تیری ماں۔ چوتھی مرتبہ انھوں نے پھر پوچھا: اس کے بعد؟ تب آپؐ نے فرمایا: تیرا باپ۔ (بخاری ومسلم)

بچوں کی پرورش میں ماں اور باپ دونوں شریک ہوتے ہیں، لیکن حمل کی تکلیف برداشت کرنا، ولادت کی تکلیف برداشت کرنا، دودھ پلانے کی تکلیف برداشت کرنا، ان میں باپ شریک نہیں ہوتا۔

اسلام نے عدل اور مساوات کا حکم دیا ہے۔ اس نے تمام لوگوں کو ان کے حقوق عطا کیے ہیں اور کسی کے ساتھ بھی ناانصافی کا معاملہ نہیں کیا ہے۔ میاں بیوی کے حقوق، والدین کے حقوق، بھائی بہن کے حقوق، سب کو شریعت نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

بہت سے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج بچوں کو دینی تعلیم بالعموم نہیں ملتی۔ جب وہ ڈھائی سال کے ہوتے ہیں تو نرسری کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ ہائی اسکول، گریجویشن اور ڈاکٹریٹ تک انھیں دینی تعلیم نہیں دی جاتی۔

بچے اسکول جاتے ہیں، وہاں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم سے واقف کرائیں۔ اگر ایسا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس تعلق سے سوال کرے گا۔ اس وقت ہم کیا جواب دیں گے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (التحریم:٦)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

ہمیں اپنی اولاد کی دینی تربیت اور دینی تعلیم کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ ہم اس پہلو سے بہت کوتاہ ہیں۔ ہمیں اس بات کی تو بہت فکر ہے کہ ہمارا بیٹا ڈاکٹر، انجینیر اور آرکیٹیکٹ کیسے بنے گا اور کہاں اسے اچھی سے اچھی جاب ملے گی؟ ہندوستان میں رہے گا یا امریکہ، انگلینڈ، امارات، کنیڈا یا افریقہ میں رہے گا؟ لیکن آخرت میں ان کی کامیابی کے لیے فکر مند نہیں ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات سے انھیں واقف کرائیں اور اسلام کی جو کچھ بھی معلومات ہمیں حاصل ہیں، ان تک پہنچانے کی کوشش کریں، انھیں دینی تعلیم سے آراستہ کریں، ان کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ کریں۔ اصلاً تو یہ کام والدین اور سرپرستوں کے کرنے کا ہے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسی کمیٹیاں بنائیں، جو ان نوجوان مسلمانوں کی کونسلنگ کر سکیں۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تو موجودہ تعلیم کے ماحول میں اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ لوگ اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں گے۔

موجودہ وقت میں تعلیم عام ہو رہی ہے۔ بعض بڑے شہروں میں تو غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح بہت کم ہے، ان میں کیرلہ، چنئی وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی صورت حال میں جہاں ہم بہت سی دوسری باتوں کی فکر کرتے ہیں وہیں ہمیں اس بات کی بھی فکر کرنی چاہیے کہ بچوں کی صحیح اسلامی کونسلنگ ہو، تاکہ وہ اسلامی تعلیم سے واقف ہوسکیں۔ الحمد

للہ اس تعلق سے اسلامی لٹریچر بھی موجود ہے، اس کے ذریعہ بھی اسلامی تعلیمات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس تعلق سے سنجیدہ ہوں اور کوئی سسٹم اختیار کریں تب جا کر صحیح معنوں میں ہم انھیں تعلیم دے سکیں گے۔

جماعت اسلامی ہند نے جو مہم شروع کی ہے، مسلمانوں کی جتنی تنظیمیں ہیں، سب نے اس کی تائید کی ہے اور اسے بروقت اقدام قرار دیا ہے۔ جماعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پندرہ دن تک ہم پورے ملک میں اس کا ایک ساتھ احساس دلائیں گے، تا کہ اس کے حق میں ایک خوش گوار ماحول بنے، پرسنل لا کی اہمیت محسوس کی جائے اور اس پر عمل کا جذبہ پیدا ہو۔حکومت اور اسلام دشمن لوگوں نے طلاق کا دامن پکڑ لیا ہے اور اسی کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ہم لوگوں کو طلاق کے بارے میں بھی سمجھائیں گے، اس کے صحیح طریقہ سے انھیں روشناس کرائیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام صرف جماعت اسلامی کے کرنے کا نہیں ہے، یہ تو پوری امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔تمام مسلم تنظیموں کی ذمہ داری ہے ۔ یہ بات یاد رکھیے کہ پندرہ (۱۵) دن کے بعد یہ سعی و جہد ختم نہیں ہونی چاہیے۔اس کے بعد بھی ہماری مسلسل کوشش ہونی چاہیے۔اس کا برابر جائزہ لیتے رہنا بہت ضروری ہے۔اس کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے، تب جا کر ہم اپنے مقصد میں کام یاب ہو سکیں گے۔

مکی دور کی احادیث۔ سیرتِ ابن اسحاق میں (۲)

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

حضرت زیدؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا قبولِ اسلام

حضرت زیدؓ اور حضرت ابوبکر کے قبولِ اسلام کے ضمن میں دونوں میں سے ہر ایک کے بارے میں مکالماتِ نبوی کا ذکر ابن اسحاق نے کیا ہے۔ محقق حمدی نے نبوی کلمات کو جلی حروف میں چھاپ کر ان کو احادیث کا درجہ دیا ہے۔ بہر حال وہ صحیح مکالمات اور صحیح احادیث ہیں، جو کتبِ سیرت میں ملتی ہیں۔ ان میں اول حضرت زیدؓ کے قبلِ بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آنے، ان کے خاندان والوں کے انہیں آزاد کرانے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انہیں اختیار دینے کے مکالمات ہیں اور حضرت زید کلبیؓ کے اللہ کے رسول کے پاس ہی رہنے کی ترجیح کا بھی ذکر ہے اور اس کے باعث ان کی آزادی اور اسلام کا واقعہ مذکور ہے۔ اس پر حاشیہ نگار حمدی نے کوئی تبصرہ کیا ہے نہ حاشیہ لگایا ہے (۱/ ۱۶۳) فتح الباری ۷/ ۱۱۱، مناقب زید بن حارثہ مولیٰ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تفصیل موجود ہے)

حضرت ابوبکرؓ کے بلا جھجھک دعوتِ نبوی پر لبیک کہنے کا واقعہ بہ طور حدیث مذکور ہے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے: مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جسے بھی اسلام کی طرف دعوت دی، اس نے ابتدا میں توقف، غور وخوض اور تردد کا مظاہرہ کیا، سوائے ابوبکر کے کہ انہوں نے ذرا بھی توقف اور تردد نہیں

کیا۔(۱ / ۱۶۴) حمدی حاشیہ ہے کہ یہ اسناد معضل ہے، کیوں کہ اس کے اکثر رجال غیر معروف ہیں۔۱۹؎

النحام کی وجہ تسمیہ

حضرت نعیم بن عبداللہ عدویؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے ہم خاندانی وعزیز قریب تھے اور اولین مسلمانوں (السابقون الاولون) میں شامل تھے۔ ان کے بہت مناقب وفضائل ہیں، جن پر ایک تحقیقی مقالہ کی ضرورت ہے۔ ان کو کتبِ سیرت و حدیث میں بالعموم ان کے لقب 'النحام' کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بالعموم یہ بتائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آواز یا آہٹ کو بقول ابنِ ہشام جنت میں سنا تھا: ''**لقد سمعت نحمه فی الجنة**'' (۱/۱۶۶) محقق حمدی نے اسے حدیثِ معضل قرار دیا ہے۔(۱ / ۲۱۸)۲۰؎

اسلام ومناقبِ حضرت صہیب رومیؓ

ابن اسحاقؒ نے سابقین اولین کی فہرست میں مختلف صحابہ کرام کے بارے میں تفصیلات کے ساتھ احادیث بھی نقل کی ہیں۔ حضرت صہیب بن سنانؓ کے تذکرہ میں حدیثِ نبوی لائے ہیں، جس کے مطابق حضرت صہیب رومیوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے: ''**صهیب سابق الروم**'' اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو گرفتار کرکے ارضِ روم میں غلام بنا کر بیچ دیا گیا تھا، اس وجہ سے وہ رومی کہلائے، ورنہ حقیقتاً عرب تھے۔ حمدی نے امام ہیثمی کی مجمع الزوائد ۹ / ۳۰۵ کا حوالہ دیا ہے۔ (۱ / ۱۶۷)۲۱؎

اسلامِ حضرت عمرؓ

بعض محققینِ سیرت کا خیال ہے کہ حضرت عمر بن خطاب عدویؓ کا قبولِ اسلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے۔ ابن اسحاقؒ نے جو

دعائے نبوی نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''**اللھم أید الاسلام بأبی الحکم إبن هشام أو بعمر بن الخطاب**''۔ بقول محقق حمدی اس حدیث کی تخریج امام احمد (۲ / ۹۵) اور امام حاکم (۳ / ۸۳) نے کی ہے اور علامہ البانی نے صحیح السیرۃ میں اس کو صحیح کہا ہے۔ بعض روایاتِ سیرت و حدیث میں صرف حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی دعا مانگنے کا ذکر ہے۔ تطبیق دینے والے علماء کا خیال ہے کہ پہلے آپ نے دونوں طاقت ور اکابرِ قریش میں سے کسی ایک کے لیے دعا کی تھی اور بعد میں حضرت عمرؓ کی تخصیص کر دی، کیوں کہ حافظ ابنِ عساکرؒ کے خیال میں بذریعہ وحی آپ پر یہ منکشف ہوا کہ ابو الحکم بن ہشام مخزومی اسلام نہ لائے گا۔ دوسری خاص دعا کے الفاظ یہ ہیں: ''**اللھم أید إسلام بعمر بن الخطاب خاصة**''۔ سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں یہ حدیث موجود ہے اور بقول حاکم صحیحین کی شرط کے مطابق ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن اسحاقؒ کی مشہور روایت میں حضرت خباب بن ارتؓ کا تاثر بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنی بہن حضرت فاطمہ بن خطابؓ سے صحیفۂ قرآن لے کر سورہ طٰہٰ پڑھی تو کلام کے حسن و جمال کا اعتراف کیا۔ حضرت خبابؓ کو جب یہ سنائی دیا تو وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا: ''**یا عمر، واللہ إنی لأرجو أن یکون اللہ قد خصّک بدعوۃ نبیه، فانی سمعته أمس و هو یقول...**''۔ اس کے بعد وہ اولین دعائے نبوی ہے جو دونوں کے لیے ہے۔ طویل روایتِ ابن اسحاقؒ میں دارِ ارقم کے اندر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمرؓ کے مکالمات بھی مختلف احادیث ہیں، جن کو جلی حروف میں چھاپا گیا ہے۔ (۱ / ۲۱۸ ۔ ۲۲۱ و مابعد) ۲۲ ۔

اسلامِ حضرت عمرؓ کی دوسری حدیث

ابن اسحاقؒ نے اپنی سند سے عطاؒ و مجاہدؒ کے واسطہ سے ایک اور روایت حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی نقل کی ہے۔ اس کو سیرت نگاروں نے بالعموم حضرت عمرؓ

کی اولین اثر پذیری سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک شب اپنی مجلسِ احباب میں سے کسی کو نہ پاکر طوافِ کعبہ کے لیے مسجد حرام آئے۔ وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں قرآن کی تلاوت کرتے سنا تو بہت متاثر ہوئے اور ان کے دل میں اسلام گھر کر گیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پوری کرکے اپنے دولت کدے کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے پیچھا کیا۔ راہ میں ملاقات ہوئی تو آپؐ نے ان سے پوچھا: ''**ماجاء بک یا ابن الخطاب ھذہ الساعة؟**'' (اے عمر! اس وقت یہاں کیوں؟) انہوں نے ایمان لانے کو سببِ تعاقب بتایا تو آپ نے اللہ کی تعریف کی اور فرمایا: ''**قد ھداک اللہ یا عمر**'' (اے عمر! اللہ نے تم کو ہدایت دی)۔ آپ نے میرا سینہ چھوا اور ثبات کی دعا کی۔ اس کے بعد حضرت عمر واپس ہوگئے۔ (۱/۲۲۰۔۲۲۱) محقق حمدی نے اس پر حاشیہ نہیں لکھا ہے۔ ۲۳؎

حضرت عمرؓ کو جوارِ عاص بن وائل سہمی۔

حضرت عمر بن خطابؓ کے قبولِ اسلام کی خبر خود ان کی تحریک پر قریشی شیخ جمیل بن معمر جمحی نے اکابرِ قریش کو ان کی مجالسِ کعبہ میں پہنچائی اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت عمرؓ بھی پہنچے۔ اکابرِ قریش سے ان کا مباحثہ ہوا، چنانچہ وہ حضرت عمرؓ پر پل پڑے اور حضرت عمرؓ ان سے لڑتے رہے۔ اس دوران شیخ قریش عاص بن وائل سہمی وہاں پہنچے اور انہوں نے سارا ماجرا سن کر حضرت عمرؓ کو پناہ دے دی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس وقت پانچ چھ سالہ لڑکے تھے۔ انہوں نے یہ سارا واقعہ خود دیکھا اور بیان کیا۔ وہ جوار دینے والے شیخ قریش کو نہیں پہچانتے تھے۔ ان کے استفسار پر حضرت عمرؓ نے ان کو بتایا۔ ابن اسحاقؒ کی اس روایتِ حدیث پر محقق حمدی کا حاشیہ ہے کہ اس کو امام حاکم (۳/ ۸۵) نے بیان کیا ہے اور اسے شرطِ مسلم کے مطابق بتایا ہے۔ (۱/۲۲۱۔۲۲۲) بخاری (فتح الباری ۷/ ۲۲۳: حدیث: ۳۸۶۴۔ ۳۸۶۵) نے حضرت ابن عمرؓ کی سند عالی سے ان دونوں حدیثوں کو بیان کیا ہے۔ ان دونوں میں عاص بن وائل سہمی کے حضرت عمرؓ کو جوار دینے کا موقع ان کا

گھر بتایا گیا ہے، جسے لوگوں نے گھیر لیا تھا اور حضرت عمرؓ کو مارنا چاہتے تھے۔ بخاری کی احادیث اور ابن اسحاقؒ کی حدیثِ جوار میں بہ آسانی تطبیق دی جا سکتی ہے کہ وہ دو الگ الگ مواقع کا معاملہ تھا اور عملی زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کی حدیث میں حضرت عمرؓ کا ایک بہت اہم جملہ ہے کہ ''میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ جب ہم تین سو ہو جائیں گے تو اس کو (مکہ کو) چھوڑ دیں گے تمہارے لیے یا تم اسے ہمارے لیے چھوڑ دو گے:''...**فاحلف بالله أن لو قد كنا ثلاث مائة رجل لقد تركنا ها لكم أو تركتموها لنا**''۔اسی طرح احادیث بخاری میں یہ نئی معلومات ہیں کہ بنوسہم عہد جاہلیت میں قدیم زمانے سے بنو عدی کے حلیف تھے اور حضرت عمرؓ کا انتخاب دین ان کا ذاتی حق تھا۔ ۲۴؎

اسلامِ حضرت نجاشی اور انجامِ خیر

ہجرتِ حبشہ کے بیان میں امام ابن اسحاقؒ نے نجاشی شاہِ حبشہ کے بارے میں دو احادیث/ روایات نقل کی ہیں: پہلی حدیث حضرت نجاشیؓ کے حبشہ کا بادشاہ بننے سے متعلق ہے ۔ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے، جو کافی طویل ہے۔ محقق حمدی نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے اور دلائل ابی نعیم (ص ۸۱۔ ۸۴) میں ہے، جیسا کہ علامہ البانیؒ نے اپنی کتاب صحیح السیرۃ میں کہا ہے۔ دوسری حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نجاشی کی وفات کے بعد ان کی قبر پر مسلسل نور دیکھے جانے کی بات کہی جاتی تھی: ''**مات النجاشي، كان يتحدث انه لا يزال يرئ على قبره النور**''۔حمدی حاشیہ میں علامہ البانی کی صحیح السیرۃ کے حوالے سے اس کی اسناد کو بھی حسن بتایا گیا ہے۔

اسلامِ نجاشی کے تحت ان کے کلمۂ شہادت پڑھنے اور ایمان لانے کا واقعہ بیان کیا گیا اور ان کی ایک کتابِ وصیت کا بھی ذکر ہے، جس میں حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے 'عبد و رسول اللہ' ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ آخر میں نجاشی کی موت پر آپؐ کے نمازِ جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے، مگر اس پر حمدی کا حاشیہ نہیں ہے۔(۱/۲۱۶۔۲۱۷) ۲۵؎

ہجرتِ حبشہ

مکی مسلمانوں میں خاص طور سے کم زوروں اور اپنے خاندانوں کے مظالم رسیدہ نوجوانوں کی حالتِ زار سے رسول اکرم ﷺ خاصے پریشان تھے۔ ابن اسحاقؒ نے اس پسِ منظر میں ایک حدیث نبوی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''**لو خرجتم الی أرض الحبشه فان بها ملکاً لا یظلم عنده أحد، وھی أرض صدق، حتی یجعل اللّٰہ لکم خرجاً مما أنتم فیه**'' (تم سرزمینِ حبشہ کی طرف چلے جاؤ، کیوں کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے پاس کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا اور وہ سرزمینِ صدق ہے، اس وقت تک کے لیے جب تک اللہ تمہاری اس موجودہ ابتلا سے نکلنے کا راستہ نہ نکال دے)۔ اس پر محقق حمدی کا حاشیہ یہ ہے: ابن اسحاق نے اس کی سند نہیں بیان کی (۱/ ۲۰۴) ۲۹ ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہجرتِ حبشہ

امام زہری کی حضرت عروہؒ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ کی حدیث، امام ابن اسحاق نے، ان کی ہجرتِ حبشہ کے سلسلے میں نقل کی ہے۔ ان کے بہ قول سرزمینِ مکہ جب ان کے لیے تنگ ہوگئی اور وہ تکالیف سے پریشان اور رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے حالاتِ ابتلا سے کبیدہ خاطر ہوگئے تو رسول اکرم ﷺ سے ہجرتِ حبشہ کی اجازت لی اور روانہ ہوگئے۔ راستے میں احابیش کا سردار ابن الدغنہ ملا اور وہ ان کو واپس مکہ لے آیا۔ اس نے اکابرِ قریش کے سامنے ان کو اپنی جوار و محافظت میں لینے کا اعلان کیا اور اکابرِ قریش نے قومی روایاتِ جوار کے پاس میں اسے قبول کرلیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کے باہری صحن میں تعمیر کردہ مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے اور قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے تو خوب روتے۔ ان کی تلاوت سن کر کفارِ مکہ کے بچے، غلام اور عورتیں جمع ہوجاتیں اور ان کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتیں۔ اکابرِ قریش کو خطرہ پیدا ہوا تو انھوں نے ابن الدغنہ سے جا کر درخواست کی کہ وہ حضرت ابوبکرؓ سے کہیں کہ وہ اپنے گھر کے اندر نماز پڑھا کریں۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ابن الدغنہ کی جوار

واپس کردی اور مسجد کی جگہ بدلنے سے انکار کردیا۔اس کے بعد ہی قریش کے ایک بے وقوف نے راستہ میں، جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کعبہ جارہے تھے،ان کے سرِ مبارک پر خاک ڈال دی۔ایک شیخ قریش ولید بن مغیرہ مخزومی یا عاص بن وائل سہمی سے حضرت ابوبکرؓ نے شکوہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔حضرت ابوبکرؓ نے اپنے رب سے دعائے سلامتی مانگی۔(۱/ ۱۵-۱۶)محقق حمدی نے اول حدیث ہجرت کی سند کو علامہ البانی کی حوالے سے 'جیّد' بتایا ہے اور واقعۂ سفیہ کو 'صحیح مرسل' کہا ہے۔ ۲۷ے

قریشی عناد

قریشی اکابر کی مخالفتِ اسلام کی احادیثِ ابن اسحاق کو چند تقسیموں کے خانوں میں رکھ کر بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک خانہ یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام کے افراد و طبقات کو مظالم کا شکار بناتے تھے۔ دوسری قسم یہ ہوسکتی ہے کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے اور ایک تیسری تقسیم یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ قرآن مجید اور کلام اللہ کے سلسلے میں فکری و عملی مباحثوں کی شکل میں نزاع و اختلاف کرتے اور اسے جھٹلاتے تھے۔ یہ تجزیاتی مطالعہ کی ایک جہت ہے، ورنہ ابن اسحاق اور دوسرے سیرت نگار واقعاتِ مظالم کو ایک پیرایے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کے درمیان دوسرے موضوعات بھی آ جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کا تعلق بھی مظالم وعنادِ قریش سے ہوتا ہے۔

سابقین اولین پر ظلم وستم

(الف) حضرت بلال حبشیؓ پر ظلم وستم:

حضرت بلال حبشیؓ کے باب میں ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ ان کے بنو جمح کے موالی یا سرپرستِ خاندان خاص کر امیہ بن خلف جمحی سخت دھوپ میں ان کو تپتی چٹانوں پر لٹا دیتا اور ان کے سینے پر سخت چٹان رکھ دیتا اور انکارِ اسلام کا تقاضا کرتا۔

حضرت بلالؓ اس عظیم ابتلا میں ہوش کھو بیٹھتے اور زبان سے صرف 'احد احد' کہا کرتے تھے۔حمدی نے اس کی اسناد کو 'مرسل' کہنے پر اکتفا کیا ہے۔(۱/۲۰۱)۲۸؎

(ب) آل یاسرؓ پر مظالم

ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ بنومخزوم کے لوگ حضرت عمار بن یاسرؓ اور ان کے والدین کو سخت گرمی میں ستایا کرتے تھے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے تو ان کو صبر کی تلقین فرماتے اور جنت کی بشارت دیتے: ''**صبراً آل یاسر، موعد کم الجنۃ**''۔حمدی نے اس حدیث کو علامہ البانی کے حوالے سے 'حسن صحیح' کہا ہے۔انھوں نے اپنی کتابِ سیرت میں اور امام احمد نے بھی اپنی حدیث (۴۳۹)میں ابن اسحاق کی روایت بیان کی ہے۔۲۹؎

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ستمِ اکابر

ابوجہل مخزومی کی ستم گری

شیخ بنی ہاشم و بنی مطلب جناب ابو طالب کی بے پناہ حمایت ونصرت کے باوجود قریشی امامانِ کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم کرتے۔معاندین میں سب سے آگے ابوجہل (ابوالحکم) بن ہشام مخزومی تھا۔ابن اسحاقؒ نے ایک واقعۂ ستم اور اس سے وابستہ حدیثِ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ایک دن ابوجہل ایک پتھر ہاتھ میں لے کر بیٹھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتا رہا، تاکہ اس سے ضربِ کاری لگائے۔رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسبِ معمول مسجد حرام آئے اور نماز میں مشغول ہوگئے۔جب آپ سجدہ میں گئے تو ابوجہل نے آگے بڑھ کر پتھر اٹھایا اور آپ کی طرف چلا۔قریشی اکابر اپنی اپنی مجالس میں اس کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔آپ کے قریب آ کر وہ خوف زدہ ہوکر پیچھے بھاگا، پتھر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کا چہرہ فق ہوگیا۔اکابرِ قریش نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک انتہائی خوف ناک اور لحیم شحیم اونٹ اس کی

طرف بڑھا، تا کہ اسے کھا جائے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”وہ جبریل تھے۔ اگر وہ قریب آتا تو وہ اسے پکڑ لیتے۔“ حمدی نے اپنے حاشیہ میں دلائل النبوۃ (۲/ ۱۹۱) کا حوالہ دیا ہے۔ ۳۰؎

ابولہب وام جمیل کی مخالفت وعداوت

جانی دشمنوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل روایتِ عرب کے برخلاف شامل تھے۔ ابولہب آپ کی تکذیب کرتا اور لوگوں کو آپ سے ملنے سے روکتا اور دوسرے مظالم کیا کرتا، جب کہ اس کی بیوی آپ کی گزرگاہ پر کانٹے بچھا دیا کرتی تھی۔ ان دونوں کے بارے میں سورۂ لہب نازل ہوئی۔ ام جمیل نے جب اسے سنا تو کعبہ کے پاس مجلسِ نبوی میں پہنچی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک پتھر کی نوکیلی کنکریاں بھری تھیں، مگر وہ آپ کو معجزۂ الٰہی سے دیکھ نہ سکی اور اس کی نگاہ آپ کے رفیقِ صدیق حضرت ابوبکرؓ پر پڑی۔ اس نے ان سے آپ کا پتہ پوچھا اور کہا کہ ”وہ میری ہجو کرتے ہیں۔ اگر میں ان کو آج پا لیتی تو اس پتھر سے ان کا منہ توڑ دیتی۔ میں خود شاعرہ ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے مذمت میں تین مصرعے کہے اور واپس چلی گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: ”وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نگاہ چھین لی تھی۔“ ابن اسحاقؒ نے ام جمیل کے ہجو یہ مصرعوں میں ’مذمم‘ کے حوالے سے دوسری روایت لکھی ہے کہ قریش رسول اکرم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ’مذمم‘ کہتے تھے اور پھر برا بھلا کہتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر فرماتے: ”کیا تم کو تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالی نے میری جانب سے قریشی اذیت کو پھیر دیا ہے۔ وہ کسی ’مذمم‘ کو گالیاں دیتے اور مذمت کرتے ہیں اور میں تو محمد (ﷺ) ہوں“: **”ألا تعجبون لما يصرف الله عني من أذى قريش، يسّبون ويهجون مذمماً، وأنا محمد“**۔ حدیث بخاری (۳۵۳۳) کا متن یہ ہے: **”ألا تعجبون كيف يصرف الله عني شتم قريش ولعنهم؟ يشتمون مذمّماً و يلعون مذمّماً، وأنا محمد“**۔

حمدی نے حاشیہ میں دوسری حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ صحیح ہے اور بخاری کی حدیث ۳۵۳۳ کا حوالہ دیا ہے، جب کہ اول الذکر کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے[۳۱]۔

سورۂ لہب کا سببِ نزول

ابن اسحاقؒ نے مجہول صیغۂ ماضی 'حُدِّثت' (مجھ سے بیان کیا گیا) سے ایک بلا سند روایت سورۂ لہب کے نزول کے سبب میں بیان کیا ہے کہ ابو لہب اپنی تمام دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی کہتا تھا کہ محمدؐ مجھ سے بعض ایسی چیزوں کا وعدہ کرتے ہیں جن کو میں صحیح نہیں سمجھتا۔ ان کا گمان ہے کہ وہ موت کے بعد واقع ہوں گی۔ اسی نے 'تباً لک' پہلے استعمال کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ لہب نازل کی۔ حاشیہ نگار حمدی کا کہنا ہے کہ یہ اسناد بلا شبہ ضعیف ہے کہ کلمہ 'حُدِّثت' سے راوی کا پتہ نہیں چلتا۔[۳۲]

سورۂ کوثر کا سببِ نزول

بنو سہم کے شیخ اکبر اور قریشی اکابر میں صاحبِ جلال و جبروت عاص بن وائل سہمی نے ایک طرف تو حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر ان کو جوار دے دی اور دوسری طرف وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتا، طنز کرتا اور قریشی اکابر سے کہتا کہ "آپ کو چھوڑیں، وہ تو لاولد شخص ہیں (ابتر)، مرجائیں گے تو ان کا ذکر بھی ختم ہوجائے گا۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر نازل کی۔ محقق حمدی نے اس شانِ نزول پر کوئی حاشیہ نہیں لگایا ہے۔ (۳ / ۲۸ وما قبل)[۳۳]

کوثر کی تفسیر میں ابن اسحاقؒ نے حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ ان کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا: "**نهر كما بين صنعاء الى ايلة، آنيته كعدد نجوم السماء، ترده طيور لها كأعناق الإبل**" راوی کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: "**انّها يا رسول الله لنا عمة، قال: آكلها أنعم منها**"۔ محقق

حمدی نے علامہ البانی کی صحیح السیرۃ سے تخریج نقل کی ہے کہ امام احمد (۳/ ۲۲۰۔ ۲۲۱، ۲۳۶۔ ۲۳۷) نے اس کی روایت کی ہے، ترمذی (حدیث :۲۶۶۵) نے اسے حسن کہا ہے، حاکم (۲ / ۳۵۷) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ایک روایتِ احمد میں حضرت عمرؓ کی جگہ حضرت ابوبکرؓ ہے اور وہ روایت 'منکرۃ' ہے۔ ۳۴؎

ابن اسحاق نے آخر میں مزید نقل کیا ہے کہ میں نے اسی حدیث میں یا کسی دوسری حدیث میں یہ بھی سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس نے اس سے پی لیا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔: "**من شرب منه لا يظمأ أبداً**"۔ حاشیۂ محقق ہے کہ صحیح حدیث ہے اور وہ حوض کی ایک حدیث کا ایک طرف ہے جو صحیحین میں ہے اور ظلال الجنۃ (۷۲۸) میں اس کی تخریج کی گئی ہے۔ ۳۵؎

سورۂ کافرون کا نزول

امامِ موصوف کی سیرت میں ہے کہ متعدد اکابرِ قریش: اسود بن مطلب اسدی، ولید بن مغیرہ مخزومی، امیہ بن خلف جمحی اور عاص بن وائل سہمی نے، جو اپنی قوم کے بڑے صاحبانِ رسوخ تھے، آپؐ کے سامنے تجویز رکھی کہ ہم آپ کے رب کی عبادت کریں اور آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ اس طرح عبادت کے معاملے میں ہمارا موقف مشترک ہو جائے گا...الخ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کافرون نازل فرمائی۔ حمدی حاشیہ ہے کہ ابن اسحاق میں یہ حدیث معلق آئی ہے اور ابن جریر طبری نے اسے موصول نقل کیا ہے۔ ۳۶؎

سورۂ یٰسٓ کی آیات کا نزول

اس سے ذرا پہلے امامِ موصوف نے سورۂ یٰس کی آیاتِ کریمہ: ۷۸۔ ۸۰ کے سببِ نزول کے ساتھ ایک حدیثِ نبوی بھی نقل کی ہے۔ ابی بن خلف جمحی نے ایک بوسیدہ ہڈی لے کر خدمتِ نبوی میں حاضری دی اور اسے دکھا کر کہا: "کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی ازسرنو زندہ کرے گا، جب کہ یہ بوسیدہ اور ریزہ ریزہ

ہورہی ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، میں یہ بات کہتا ہوں ۔ جب تم بھی اسی طرح ہوجاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اٹھائے گا اور تمھیں بھی۔ پھر تمھیں جہنم میں ڈال دے گا۔'' اسی واقعہ کے بعد یہ آیاتِ کریمہ اتریں۔ محقق حمدی نے اسے بھی معلق حدیثِ امام کہا ہے اور امام طبری کے ہاں موصول بتایا ہے۔ وہ اسے صحیح مرسل بھی کہتے ہیں۔ امام حاکم کے نزدیک وہ حدیث ابن عباسؓ ہے، جو صحیح اور شرطِ شیخین کے مطابق ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیات کا نزول

قریشی اکابر میں ایک عالم شخص عبداللہ بن الزبعریٰ سہمی بھی تھا۔ نضر بن حارث اور ولید بن مغیرہ بھی کافی صاحبانِ فہم و ذکا تھے۔ مؤخر الذکر دونوں نے ابن الزبعریٰ سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہے کہ ہم جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں وہ سب کے سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ ابن الزبعری نے کہا کہ میں اگر وہاں ہوتا تو محمدؐ سے بحث کرتا کہ ہم تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، عزیر کی عبادت یہود اور عیسیٰ کی عبادت نصاریٰ کرتے ہیں، تو کیا یہ سب بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے؟ آپؐ سے قولِ ابن الزبعریٰ نقل کیا گیا تو آپ نے وضاحت فرمائی: ''**انّ کل من أحبّ أن یعبد من دون اللّٰہ فھو مع عبدہ، انھم یعبدون الشیاطین و من امرتھم بعبادتہ**'' اس پر سورۂ انبیاء کی آیات ۱۰۱:۔ ۱۰۲ اتریں اور دوسری آیات بھی۔ ابن اسحاقؒ نے حضرات مسیح وعزیر علیہما السلام کے بارے میں بھی آیاتِ قرآنی کے نزول کا ذکر کیا ہے، لیکن ان پر حاشیۂ محقق نہیں ہے۔ ۳۷۔

قرآن کریم کے نزول پر اعتراض

ابن اسحاقؒ نے سورۂ زخرف ۳۱:۔ ۳۲ کے نزول کا سبب یہ بتایا ہے کہ ولید بن مغیرہ مخزومی نے کہا کہ کیا قرآن محمد پر اترتا ہے اور مجھے چھوڑ دیا جاتا ہے، جب کہ میں قریش کا سید وکبیر ہوں اور ابو مسعود عمرو بن عمیر ثقفی کو بھی نظر انداز کردیا جاتا ہے، جو ثقیف کا سردار ہے اور ہم دونوں شہروں کے عظیم ہیں۔ امام

موصوف نے اسی طرح متعدد دوسری آیاتِ کریمہ اور قرآنی سورتوں کے اسبابِ نزول اور ان سے متعلق امور کے باب میں بیان کیے ہیں۔ان میں بالعموم احادیثِ نبویہ کا ذکر ملتا ہے نہ ان کے حوالے سے محققِ گرامی کے حواشی کا،لیکن وہ بہر کیف احادیث اور روایات پر مبنی ہیں اور ان کا ذکر کتبِ تفسیر، خاص کر طبری و ابن کثیر کی تفاسیر میں ملتا ہے۔ ان کے ذریعہ ان احادیثِ خاص کا سراغ لگایا جاسکتا ہے جو تفسیری روایات کا خاصہ ہے۔ ان میں سب سے زیادہ طویل بحث ابن اسحاق نے سورۃ الکہف کی تفسیر اور شانِ نزول میں کی ہے کہ وہ قریشی اکابر کے مخاصمانہ سوالات کی وجہ سے اور یثرب کے یہودی علماء و احبار کی علمی اعانت ومجادلانہ خیانت کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ ان میں قریشی اکابر کے مطالبات بھی ہیں۔(۲/ ۷۔۱۱)۳۸۔

سورۂ کہف کی آیات سے متعلق احادیث

ابن اسحاقؒ نے سورۂ کہف کی تفسیر میں کئی مباحث کے علاوہ متعدد احادیث یا ان کے اجزاء کا ذکر کیا ہے، جیسے یہ حدیث ،جس میں رسول اللہ ﷺ اپنی بعثت کے مقصد کے بارے میں بیان کرتے ہیں: ”...**مابھذا بعثت الیکم، انما جئتکم من اللہ بما بعثنی بہ، وقد بلغتکم ما أرسلت بہ الیکم، فان تقبلوہ فھو حظّکم فی الدنیا والآخرۃ، وان تردہ علیّ أصبر لأمر اللہ تعالیٰ حتی یحکم اللہ بینی و بینکم۔**“

قریشی اکابر نے بازاروں میں ان کی طرح معاشِ تلاش کرنے کی نبوی مساعی پر طنز کرتے ہوئے کہا: ”اگر آپ سچے رسول ہیں تو اپنے رب سے سب کچھ مانگ کچھ نہیں مانگ لیتے۔“ اس پر آپؐ نے فرمایا: ”**ما أنا بفاعل، وما أنا بالذی یسأل ربہ ھذا، وما بعثت الیکم بھذا، ولکن اللہ بعثنی بشیراً و نذیراً۔** (اوکما قال) **فان تقبلوا ما جئتکم بہ فھو حظّکم فی الدنیا والآخرۃ** الخ (بقیہ اول حدیث کی طرح)

قریشی کافرین کے مطالبہ پر کہ ہم پر آسمان گرادینے کی دعا کریں، فرمایا: ''**ذلک الی اللہ، ان شاء أن یفعلہ بکم فعل**۔''

سورہ مریم: ۶۴ ''**وما نتنزل الا بأمر ربّک** سے متعلق حدیثِ امام ہے: ''... **لقد احتسبت عنی یا جبریل حتی سوء ت ظنّنا**''۔

ان تمام احادیث اور سورۂ کہف کی دوسری آیات سے متعلق احادیث واسباب نزول کی روایات کے بارے میں حاشیہ نگار نے حواشی نہیں لکھے ہیں۔ حضرت ذوالقرنین کے بارے میں مروی حدیث: ''**ملک مسح الارض من تحتھا بالأسباب**'' کو حدیث مرسل کہا ہے کہ اس کے راوی اول خالد کلاعی تابعی ہیں۔(۱/ ۱۸۷۔ ۱۸۸ وما بعد وما قبل، بالخصوص ۱۹۴۔۱۹۵) اسی طرح سورۂ اسرائ:۸۵ کی آیت ''**وَمَا أوتِیتُم مِنَ العِلم إلا قَلِیلاً**'' کے بارے میں ایک حدیث: ''**انما فی علم اللہ قلیل و عندکم فی ذلک ما یکفیکم لو أقمتموہ**'' کی اسناد کو منقطع بتایا ہے۔۳۹

اکابرِ قریش کے مطالبات

ابو طالب کی حمایت ختم کرنے کی مساعی

ذاتِ نبوی پر شخصی مظالم سے بڑھ کر قریشی معاند اکابر کی وہ مساعی تھیں جن کے ذریعہ وہ آپ کو حمایتِ ابی طالب سے محروم کردینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ بار بار ابو طالب کے پاس جاتے اوران سے مطالبہ کرتے کہ وہ اپنے بھتیجے کو اسلام کی تبلیغ وتعلیم سے روکیں۔جب وہ اس اولین مرحلے میں کام یاب نہ ہوئے تو انھوں نے آپ کو اکابر قریش کے حوالے کردینے کا مطالبہ کیا اورطرح طرح کی تجاویز رکھیں،لیکن ابو طالب نہ مانے۔قریشی اکابر کا جبرو دباؤ بہت بڑھا تو ابو طالب نے آپ کو وفد کے سامنے یاد کرکے آپ سے کہا کہ ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ وہ اسے اٹھا نہ سکیں۔آپ کو خیال ہوا کہ اب مشفق وحامی چچا بھی حمایت سے دست کش ہونے والے

ہیں تو آپ نے پورے عزم وثبات کے ساتھ وہ بات کہی جس نے ابو طالب کو بھی جما دیا۔ ابن اسحاقؒ نے وہ مشہور حدیث نقل کی ہے جو تمام کتب سیرت میں ملتی ہے: "**یا عم، لو وضعوا الشمس فی یمینی و القمر فی یساری علی أن أترک ھذا الأمر، حتی یظھر اللہ أو أھلک فیہ، ما ترکتہ**۔ حاشیۂ حمدی ہے کہ یہ حدیث اپنی شہرتِ عام کے باوجود ضعیف ہے، ملاحظہ ہو فقہ السیرۃ والسلسلۃ الضعیفۃ للالبانیؒ، حدیث ۹۰۹۔ علامہ البانیؒ نے محض اسناد کے ضعف وسقم کی بنا پر اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

تمام نقد و جرح کے باوجود یہ حدیث اپنے الفاظ و معانی کی وجہ سے نہ صرف قوی ہے، بلکہ وہ شخصیتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم وثبات اور قرآنی آیات کے اثباتِ حق کے تناظر کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ازراہِ رحمت ومحبت اپنے رسول مکرمؐ کو دعوتِ حق کی راہ میں اپنی جان خطرے میں نہ ڈالنے کی نصیحت کی ہے: "**فَلَعَلَّکَ باخِعٌ نَّفسَکَ عَلٰی آثَارِھِم إِن لَم یُؤمِنوا بِھٰذا الحَدِیثِ أَسَفًا**"۔ (الکھف ۶) ایسی دوسری آیاتِ کریمہ ہیں اور متعدد صحیح احادیث آپ کے فرمان اور موقف کو معتبر بناتی ہیں۔ اس طرح وہ اصطلاحی لحاظ سے اس حدیث کی شاہد ہیں۔ مسند احمد میں قریشِ مکہ کے دوسرے مطالبات کا بھی ذکر ہے، جیسے کوہ صفا کو سونے کا پہاڑ بنانے کی احادیث (۳۱۶۷، ۳۲۱۳، ۲۳۲۹: مسند ابن عباسؓ) اللہ کا نسب نامہ بتانے کا مطالبہ، آخرت وتقدیر پر اعتراض اور ایسے متعدد دوسرے نظریاتی اور فکری مطالبات، جن کے نتیجے میں سورہ اخلاص وغیرہ پر مبنی قرآنی آیات نازل ہوئیں۔

صحیفۂ مقاطعہ اور اس کی منسوخی

معاند اکابرِ قریش نے جب حمایتِ ابی طالب کے توڑنے میں ناکامی وذلت کا مزہ چکھا تو بنو ہاشم وبنو مطلب کے خاندانوں کا سماجی مقاطعہ (بائیکاٹ) کرنے کا معاہدہ کر کے اسے حسبِ دستورِ قریش وعرب خانۂ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا، حالاں کہ بیش تر قریشی اکابر، عوام وخواص اور خاص کر ان کے صلح جو اور قرابت کے

رشتوں اور صلہ رحمی کے حامی طبقات اس سے متفق نہ تھے، لیکن ستم گروں کی زیادتی اور ظلم وفساد کے جبر کے سامنے دب گئے۔سہ سالہ آزمایشِ مسلم اور کرب و بلائے اکابر کے بعد بال آخر پانچ صالح وسعید اکابر نے اس ظالمانہ معاہدے کو منسوخ کرادیا اور اس کی ربّانی منسوخی کا ذکر زبانِ رسالت مآب ﷺ سے اس وقت ہوا جب آپ نے ابو طالب سے کہا کہ میرے رب اللہ نے صحیفۂ قریش پر دیمک کو مسلط کردیا اور اس نے صرف اس مقام کو، جہاں اللہ کا نام ہے، باقی رکھا اور ظلم وقطع رحمی اور بہتان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا: ''**یا عم، إنّ ربی اللّٰہ قد سلّط الأرضۃ علی صحیفۃ قریش، فلم تدع فیھا إسماً ھو للّٰہ الا أثبتتہ فیھا، و نفت منہ الظلم و القطیعۃ و البھتان**''۔اس پر حمدی حاشیہ نہیں ہے۔(۲ / ۳۔۱۸)۴۰ے

بعض اکابرِ قریش سے تعلقات

تبلیغ واشاعت کے اہم اور پُرخطر معاملے میں بسا اوقات رسول اکرم ﷺ کو عزم وثبات کے ساتھ مقابلہ ومزاحمت کے اقدام کرنے پڑے۔ان میں کچھ انصاف دلانے کے منصبِ رسالت سے متعلق تھے، کچھ کا تعلق اثباتِ نبوت اور دلایلِ رسالت سے تھا اور کچھ دوسری نوعیتوں کے حامل تھے۔ ان میں شخصی دفاع اور ملّی تحفظ کے اقدامات بھی تھے۔عرب سماجی نظام تحفظ کے تحت آپ نے متعدد بے کس اور خاندان بدر صحابۂ کرام کو اکابرِ قریش کے اختلاف کے باوجود جوار فراہم کیا تھا۔رحمۃ للعالمین ہونے کے باعث آپ ان کے شرک وکفر سے اختلاف کرتے تھے، لیکن ان کی ہدایت واصلاح کے ہمہ وقت در پے رہتے اور اس سبب سے ان سے سماجی تعلقات بھی رکھے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام دونوں تمام انسانوں کی دنیاوی واخروی فلاح وبہبود کا نظام برپا کرنا چاہتے تھے، جو قرآنی اصطلاح میں عدل (اجتماعی عدل) کا نظام ہے۔

مظلوموں کی دادرسی

مظلوموں کی دادرسی کا ایک واقعہ فرعونِ امت ابوجہل مخزومی سے متعلق ہے۔

حلف الفضول کی پابندی کے سبب اور اسلامی تقاضائے عدل سے آپ نے ابوجہل مخزومی سے ایک اراشی تاجر کا حق دلوایا۔ سیدِ قریش نے اس سے ایک اونٹ خریدا تھا، مگر اس کی قیمت نہیں ادا کی تھی۔ اس تاجر نے اکابرِ قریش کی مجالس میں فریاد کی اور ان ظالموں نے محض لطف لینے کے لیے اسے آپ کے پاس بھیج دیا کہ وہی تم کو انصاف دلا سکیں گے۔ قصہ طویل ہے اور اس میں خاصے مکالمات ہیں۔ ان کی شکل میں حدیثِ نبوی کے کئی اجزاء ہیں۔ بہر حال آپ نے ابوجہل کے گھر پہنچ کر اسے پکارا۔ وہ باہر نکلا تو فرمایا: ''اس آدمی کا حق ادا کرو''۔ اس نے بلا چون و چرا اس کا حق ادا کر دیا۔ اکابرِ قریش نے جب یہ انہونی سنی اور دیکھی تو ابوجہل سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس نے بتایا: ''میں نے ایک زبردست اونٹ کو دیکھا جو منہ پھاڑے مجھے کھانے کے درپے ہے۔ چنانچہ میں نے گھبرا کر اس تاجر کا حق ادا کر دیا۔'' اس پر محقق حمدی کا حاشیہ نہیں ہے۔ غالباً ان کو اس کی تائید میں کوئی حدیث نہیں ملی، لیکن یہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔

کشتی لڑنے کا واقعہ

رکانہ بن عبدِ یزید مطلبی سے کشتی اور معجزات کے واقعہ کے تحت متعدد احادیث کا ذکر ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی کسی وادی میں رکانہ سے ملاقات کی تو اسے دین کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ اگر تمہاری بات سچ جانتا تو مان لیتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں تمہیں کشتی میں پچھاڑ دوں تو جان لوگے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں؟'' اس نے کہا: ہاں، آپؐ نے اسے ذرا دیر میں پچھاڑ دیا، حالاں کہ وہ بڑا پہلوان تھا۔ ایسا تین بار ہوا۔ پھر آپ نے ایک درخت کو اس کی جگہ سے بلایا اور پھر اسے اس کے مقام پر واپس بھیج دیا۔ ان دونوں معجزات کی احادیث مکالمات کی شکل میں ہیں۔ محقق حمدی نے ان کی تخریج نہیں کی ہے۔ (۲/ ۲۵۔۲۶) ۴۱ے

صحابی کی تلاوتِ قرآن پر قریشی ردعمل

عام اکابر اور خواص کے علاوہ معاندینِ قریش کا رویہ رسولِ اکرم ﷺ،

قرآن مجید اور صحابۂ کرام کے بارے میں متضاد جہات کا حامل تھا۔ ایک طرف تو وہ قرآن کریم کو کلامِ الٰہی نہیں مانتے تھے، اس کا اور رسول اللہ ﷺ پر اس کے نزول کا تمسخر کرتے، اس کے احکام وتعلیمات میں کیڑے نکالتے، دوسری طرف وہ قرآن کریم کی آیات سنتے تو مبہوت و مرعوب ہوجاتے، اس کی فصاحت و بلاغت اور حکمت و معانی سے ششدر رہ جاتے اور اسے چھپ چھپ کر سنا کرتے، تیسری طرف وہ کسی صحابی سے قرآن سنتے تو طیش میں آجاتے اور مارپیٹ کرتے۔ ان متضاد رویوں سے متعلق دو احادیث سماعتِ قرآن کے بارے میں پیش ہیں۔ روایاتِ سیرت اور احادیث نبوی دونوں میں اور قرآنی آیات کی تفسیری روایات میں بھی اکابر اور عوام وخواص کے قرآن مجید سننے اور صحابۂ کرام کے سنانے کے واقعات کثرت سے مروی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تلاوتِ قرآن

حضرت عروہ بن زبیرؒ کی سند سے مروی روایت کی بنا پر ابن اسحاقؒ نے بیان کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولین شخص، جنہوں نے بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کی، وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ اس کا واقعہ یہ تھا کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن جمع ہوئے اور باہم بات چیت میں کہا کہ قریش کو بلند آواز سے ابھی تک قرآن نہیں سنایا جاسکا ہے۔ کون ہے جو اس کی ہمت کرے گا؟ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا: میں۔ صحابۂ کرام نے کہا کہ ہم کو آپ کے بارے میں خدشہ لاحق ہے۔ ہم ایسا شخص چاہتے ہیں جس کا خاندان اس کی حفاظت کرسکے اگر ان کا ارادۂ بد ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: اس کی پروا نہ کرو، میرا اللہ میری حفاظت کرے گا۔ حضرت ابنِ مسعودؓ 'مقام' پر بہ وقتِ چاشت پہنچے۔ اس وقت اکابرِ قریش اپنی مجالس میں پرے جمائے بیٹھے تھے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ نے بلند آواز سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر سورۂ رحمن کی تلاوت شروع کردی۔ پہلے تو مشرکین کچھ سمجھے نہیں، پھر ان کو احساس ہوا کہ ابنِ ام عبد محمدﷺ کے لائے ہوئے کلام کا

کچھ حصہ پڑھ رہے ہیں، چنانچہ وہ ابنِ مسعود کے چہرے پر مارنے لگے، مگر انہوں نے جتنا چاہا اتنا پڑھا اور مار کھاتے رہے۔ صحابۂ کرام کی مجلس میں واپس آئے تو ان کے چہرے پر نشانات تھے۔ صحابہ نے کہا: ہمیں اسی کا خدشہ تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: اب تو مجھے اللہ کے دشمن بہت ہلکے لگ رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ کہیں تو میں پھر کل جا کر ان کو سناؤں؟ صحابہ نے کہا: نہیں، یہی کافی ہے، تم نے ان کو وہ سنا دیا جو ان کو ناپسند ہے۔ محقق حمدی نے اسے حدیث مرسل بتایا ہے۔ (۱/۱۹۹) ۴۲ ۔

تلاوتِ نبوی کی سماعتِ اکابرِ قریش

حضرت ابن مسعودؓ کی جہری تلاوتِ قرآن کریم کے معاً بعد ابن اسحاقؒ نے امام زہریؒ کی حدیث نقل کی ہے، جس کی سند کو مرسل کہا گیا ہے۔ مختصر واقعہ یہ ہے کہ قریش کے تین اکابر: ابوسفیان بن حرب اموی، ابوجہل بن ہشام مخزومی اور اخنس بن شریق ثقفی زہری ایک رات الگ الگ اس ارادے سے نکلے کہ نمازِ شب میں رسول اکرم ﷺ کی قراءت قرآن سنیں۔ وہ ایک دوسرے کے ارادے سے واقف نہ تھے۔ وہ رات بھر خفیہ طریقے سے قراءتِ نبوی سنتے رہے۔ صبح ہونے پر جب وہ واپس ہوئے تو راستہ میں ان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی کہ اگر ناسمجھ لوگوں نے دیکھ لیا ہوتا تو ان کے دلوں میں بات بیٹھ جاتی۔ بہر حال وہ وعدہ کر کے لوٹ گئے کہ اب ایسا نہ کریں گے، لیکن اگلی دو راتوں میں بھی ایسا ہی ہوا کہ وہ خفیہ طریقے سے قراءتِ نبوی سنتے اور صبح ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے۔ (۱/۱۹۹۔۲۰۰) ۴۳ ۔

احادیثِ وعید

اپنی ذاتِ گرامی اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں معاندین کے عناد و کفر پر رسول اکرم ﷺ صبر وضبط اور مرحمت کا مظاہرہ فرماتے۔ بسا اوقات جب ان کا ظلم وستم حدود سے بڑھ جاتا تو آپ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا اور آپ کی زبانِ مبارک سے الٰہی

وعیدوں کے شرارے نکلتے۔ وہ رحمۃ للعالمین کے کلماتِ غیظ و غضب نہ تھے، بلکہ اللہ عزیز و انتقام کے مواعید تھے، تاکہ معاندین ان سے لرز کر حق قبول کرلیں یا مظالم سے باز آجائیں۔ ان کو دفاعِ حق اور محافظتِ ذات و ملت کا نبوی اسوہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہر وقت اور ہر آن خاص کر عالمِ ابتلا و ضعف میں سرنگوں نہیں رہنا ہے۔ تحفظِ ذات و ملت اور مدافعتِ دینِ حق میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیغ براں تھے اور رسول الملحمۃ (رسولِ جہاد) بھی۔ اکابرِ قریش کے بابِ مظالم میں ایسی چند احادیثِ وعید ملتی ہیں جو امام ابن اسحاقؒ نے بیان کی ہیں اور جن کی تصدیق معتبر کتبِ حدیث سے ہوتی ہے۔

ذبح کی حدیثِ وعید

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی مرفوع و متصل سند سے ایک واقعہ ابن اسحاقؒ نے بیان کیا ہے، جو طویل ہے اور اس میں مکالمات بھی کافی ہیں۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک دن حسبِ معمول مسجدِ حرام میں تشریف لائے اور طواف کرنے لگے۔ اشرافِ قریش میں سے اکثر مقامِ حجر میں موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کر ان کا جوشِ غضب و عناد بڑھ گیا اور جب آپ ان کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپ پر جملہ بازی کی۔ رسول اکرم ﷺ کو اس سے تکدّر رہوا، جو چہرۂ انور سے بھی ظاہر ہوگیا۔ دوسرے چکر میں یہی حرکت کی گئی اور تیسرے میں بھی۔ اس بار آپ ٹھہر گئے اور ان کو مخاطب کرکے فرمایا: ''**أتسمعون یا معشر قریش، أما والذی نفسی بیدہ، لقد جئتکم بالذبح**'' (اے اشرافِ قریش! سن لو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں مری جان ہے، میں تمہارے پاس ذبح لے کر آیا ہوں۔) یہ سن کر ان لوگوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ ساکت و صامت رہ گئے۔ ان میں سے ایک سمجھ دار شخص نے بات بنائی: ''ابوالقاسم! آپ جائیں۔ بخدا آپ تو ناواقف نہیں ہیں۔'' اشرافِ قریش کو یہ وعیدِ نبوی دوسرے دن تک پھانس بن کر تلملانے پر مجبور کرتی رہی۔ دوسرے دن طواف کے دوران ایک شخص نے راہ کھوٹی کی اور ٹوکا کہ کل آپ نے ہی یہ جملہ کہا تھا۔ آپ نے فرمایا ''ہاں، میں نے ہی

کہا تھا۔''ایک شخص نے آگے بڑھ کر آپؐ کی چادر پکڑ لی ،تب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کو اس سے روکتے ہوئے کہا: ''کیا تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے''۔پھر تمام اشراف چلے گئے ۔ حمدی حاشیہ ہے کہ البانی نے صحیح السیرۃ(۱/ ۳۰۹) میں اس کی اسناد حسن بتائی ہے۔(۱/ ۱۸۳)[۴۴]

احادیثِ اسراء ومعراج

سیرت ابن اسحاق نے متعدد روایات کا ذکر ایک خاص انداز میں کیا ہے، جو بعد میں طرزِ مورخین بن گیا۔ امامِ موصوفؒ نے ایک خاص دیباچۂ اسناد میں یہ بیان کیا ہے کہ ان کو متعدد صحابۂ کرام، تابعین اور دوسری اہلِ علم شخصیات سے روایات پہنچی ہیں۔انہوں نے جن کے نام صراحت سے لیے ہیں وہ یہ ہیں: حضرات عبداللہ بن مسعود، ابوسعید خدری، ام المومنین عائشہ، معاویہ بن ابی سفیان، ام ہانی بنت ابی طالب، حسن بصری ،ابن شہاب زہری اور قتادہ رضی اللہ عنہم۔ان میں سے ہر ایک کی حدیث جداگانہ بیان کی گئی ہے اور ان کے مجموعے سے اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان معجزہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس کے بعد ابن اسحاقؒ نے الگ الگ احادیثِ صحابہ و تابعین بیان کی ہیں۔ان میں ایک خاص طرزِ ادا یہ اختیار کیا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کی روایت کا ایک حصہ بیان کر کے حضرت قتادہؒ کی روایت کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے اور پھر حضرت حسن بصریؒ کی روایت کی طرف 'عود' کیا ہے۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت قتادہؒ کا روایت کردہ وہ اضافی حصہ حسن بصریؒ کی بنیادی حدیث پر کچھ خاص اضافہ کرتا ہے۔ یہ طریقہ امام طبری وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت بیان کی ہے اور اس میں خاص حضرات ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام کے شمائل کا بیانِ نبوی ہے۔سیرتِ ابن اسحاق کے تلخیص وتہذیب نگار امام ابن ہشامؒ نے شمائل انبیاء سے متصل اور اس کی مناسبت سے حضرت علیؓ کی زبان سے شمایلِ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ پھر حضرت ام ہانیؓ کی روایت ہے۔ قصۂ معراج کی مختلف احادیث و

معاملات پر مشتمل بیان حدیثِ ابی سعید خدریؓ میں لایا گیا ہے، جو سب سے زیادہ مفصل ہے اوراس میں معراج کا ابتدائی بیان ہے، پھر داروغۂ جہنم مالک کی صفت کا ذکر بعض دیگر اہلِ علم کی ترسیل سے ہے۔ اس کے بعد آسمانوں پر عروج کا بیان حدیث حضرت ابی سعید خدریؓ کی طرف 'عود' کی صورت میں آیا ہے۔ اسی کے درمیان حضرت ابن مسعودؓ کی ایک حدیث حضرت جبریل علیہ السلام کے ایک خاص حد ادب کے بعد عروج وصعود سے لاچاری کے بارے میں امام موصوف نے اپنی طرف سے بیان کی ہے۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقاتِ نبوی اور نماز میں تخفیف کی درخواست کا معاملہ لایا گیا ہے، جو بال آخر نمازِ پنجگانہ پر تمام ہوئی۔ (۲/ ۲۹۔ ۳۷) حاشیہ نگار حمدی نے ان مختلف احادیث پر حواشی لگائے ہیں نہ تخریج کی ہے۔ آخر میں البانی کی کتاب **الاسراء والمعراج** ملاحظہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ البتہ یہ تبصرہ کیا ہے کہ اسراء و معراج کی بہت سی احادیث صحیحین میں ہیں۔ ۴۵؎

صحیحین کی احادیثِ معراج سے تقابلی موازنہ اس باب کو ہی ایک تحقیقی مقالہ بنادے گا، لہٰذا صرف چند بنیادی نکات کا ذکر مختلف عناوین کے تحت کیا جاتا ہے، تاکہ احادیثِ سیرت کی فنی قدر و قیمت اوراس سے زیادہ ان کی صحت و مرتبت کا اندازہ کیا جاسکے:

صحیحین کے رواۃِ اولین

صحیح بخاری کی مختلف کتب اور ان کے متعدد ابواب میں احادیثِ اسراء ومعراج کی روایت کرنے والے صحابۂ کرام کی تفصیل یہ ہے:

۔کتاب بدءالخلق، باب ذکرالملایکۃ: حضرات مالک بن صعصعہؓ، ابن عباسؓ، عائشہؓ وابن مسعودؓ۔

۔کتاب احادیث الانبیائ، باب المعراج: حضرت مالک بن صعصعہؓ، باب واذکر فی الکتٰب الخ: حضرات عائشہ صدیقہؓ و ابن مسعودؓ۔

۔کتاب الصلوٰۃ، باب کیف افترضت الصلوات فی الاسرائ: حضرت ابوذر غفاریؓ۔

۔کتاب التفسیر، سورۃ النجم: حضرات ابن مسعودؓ و عائشہؓ، سورۃ بنی اسرائیل: حضرت ابوہریرہؓ۔
۔صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء وذکر سدرۃ المنتہیٰ، باب ذکر المسیح بن مریم وغیرہ۔
۔صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب موسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

مضامینِ احادیث

ابن اسحاقؒ نے احادیثِ اسراء الگ بیان کی ہیں اور احادیثِ معراج الگ۔
اولین واقعہ کی تمام روایات کے بعد ان کے تمام بنیادی مضامین یہ ہیں:
۔بُراق کی صفت اور اس کی سواری سے بیت المقدس تک تشریف آوری۔ روایتِ ابن مسعودؓ۔
۔ایک جماعتِ انبیاء کی وہاں موجودگی، جن میں حضرات ابراہیم خلیل اللہ اور موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے اسماء گرامی ہیں۔
۔دودھ کے پیالے اور جامِ شراب کی پیش کش اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دودھ کا پیالہ اختیار کرنا، جس سے ہدایت کی فال لی گئی۔
۔آغاز میں رسول اکرم ﷺ کا بیان کہ آپ مقام حجر میں محوِ خواب تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو جگایا اور بابِ مسجد کے باہر لے جا کر براق پر بٹھایا۔ براق کی صفت کو روایتِ حسن بصریؒ اور براق کے بھڑکنے کا ذکر بہ روایت قتادہ۔
۔بیت المقدس پہنچ کر تمام انبیائے کرام کی نماز میں امامت اور دودھ اور شراب کے پیالوں کا ذکر، بہ روایت حسن بصری۔
۔رسول اکرم ﷺ کی صبح سویرے مکہ مکرمہ واپسی اور اسراء کا تذکرہ، قریش کا انکار و طعن، حضرت ابوبکرؓ کی تصدیق، بیت المقدس کا بہ ذریعہ کشف منظر اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دربارِ نبوی سے 'الصدیق' کا خطاب عطا کیا جانا۔
۔روایتِ حضرت عائشہ صدیقہؓ میں واقعۂ اسراء کو صرف رؤیا قرار دیا گیا ہے اور روحانی بتایا گیا ہے، جسمانی نہیں۔ اس سلسلے میں آیاتِ کریمہ الصّٰفّٰت: ۱۰۲ اور الاسرائ: ۱ سے استشہاد کیا گیا ہے، جس میں رؤیا دکھانے اور شجرۂ ملعونہ کے بتانے کا ذکر ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کی مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں سورۂ اسراء کی مذکورہ بالا آیت کا ذکر بہ طور شان نزول ہے۔ ابن اسحاقؒ نے اپنی 'بلاغت' سے ایک اور حدیث بیان کی ہے: 'تنام عیناى و قلبى يقظان۔'' (میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا ہے) اور ان کا ایک تبصرہ ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کون سی حالت ہوئی تھی۔ بہر حال آپؐ نے امرِ الٰہی سے بہت سی چیزوں کا معاینہ فرمایا، خواہ وہ نیند کی حالت ہو یا بیداری کی اور ہر دو بہ حق ہیں۔ اس سے قبل حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی جانب سے انبیاء کی طرف وحی بہ حالت بیداری بھی آتی ہے اور بہ حالتِ خواب بھی۔ حضرت عائشہؓ کے اس تاثر اور علم کے وقت ان کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی اور اس وقت مکہ مکرمہ میں اپنے والد ماجد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر میں قیام پذیر تھیں، اگرچہ بیاہی جا چکی تھیں۔

۔امام زہریؒ کی روایتِ حضرت سعید بن المسیبؓ میں حضرات ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے شمائل کا ذکر ہے۔

۔حضرت ام ہانی کی روایتِ اسراء میں ایک وضاحت و اختلاف یہ ہے کہ اسراء کا واقعہ ان کے گھر سے شروع ہوا تھا، جہاں آپ محوِ خواب تھے اور رات کی نماز کے بعد تشریف لے گئے اور صبح کی نماز ان کے ساتھ آ کر پڑھی۔ آپ نے حضرت ام ہانیؓ کے منع کرنے کے باوجود واقعۂ اسراء کو اکابرِ قریش کے سامنے بیان کیا اور انہوں نے آپ کی تکذیب کی۔ آپ نے اپنی تصدیق کے بعض دلائل و شواہد پیش کیے، جن کو اکابرِ قوم نے تسلیم کیا۔[۴۶]

معراج کی احادیثِ ابن اسحاق کے مضامین یہ ہیں:

۔معراج آسمانی (سیڑھی) کا بیان و صفت اور آسمانوں پر ملائکہ سے ملاقات اور ان کا خوش دلی سے استقبال۔ بہ روایتِ حضرت ابوسعید خدریؓ اور اس کے درمیان میں 'صفة مالک خازن النار' کی حدیث و تفصیل بعض اہلِ علم کی روایت سے، جو صحابہ تک ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے سماء دنیا کے مشاہدات، حضرت آدم علیہ السلام کا

دیدار، ارواحِ بنی آدم کا جمگھٹا وغیرہ۔ سعید/ طیب ارواح اور خراب و بدکار روحوں کا انجام: یتامیٰ کا ناحق مال کھانے والے، سودخوار، بدکار عورتیں، وغیرہ۔

۔دوسرے آسمان پر حضرات عیسیٰ بن مریم و یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے ملاقات۔

۔تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے تعارف اور ان کی صفتِ جمال۔

۔چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات اور سورۂ مریم۔، آیت ۵۷ کی تلاوتِ نبوی۔

۔پانچویں آسمان پر حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کا دیدار اور ان کی صفاتِ عالیہ۔

۔چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات اور ان کی پیکر تراشی۔

۔ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیدار اور ان کا مقام و مرتبہ۔

۔پھر جنت میں داخلۂ نبوی اور حضرت زید بن حارثہؓ کی جنتی حور کا دیدار اور بعد میں حضرت زیدؓ کو اس کی بشارت۔

۔حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کے مطابق ہر آسمان پر حضرت جبریل علیہ السلام سے سوال، اجازتِ دخول اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف۔

۔مقامِ رب پر انتہا اور روزانہ پچاس نمازوں کی فرضیت۔

۔ایک خاص عنوان کے تحت نمازمیں تخفیف کا ذکر کہ واپسی کے سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور ان کے مشورے پر آپ نے بار بار مراجعت فرما کر نمازمیں تخفیف کی درخواست کی اور ہر بار دس دس کی تخفیف کی گئی۔ آخری بار صرف پانچ رہ گئی تھیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان میں بھی تخفیف کی التجا کرنے کی بات کہی، مگر آپ نے اپنے رب سے حیا کی اور اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں کا اجر پچاس کے برابرا کر دیا۔

موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیحین کی احادیث اور روایاتِ کتب حدیث میں کچھ مضامین کا فرق و اضافہ ہے، جیسے حطیم میں شقِ صدر کا واقعہ، واقعۂ اسراء میں ایک سرخ ٹیلہ کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنے کا مشاہدہ، بیت المقدس پہنچ کر براق کو اس حلقہ سے باندھنے کا معاملہ جس سے انبیاء کرام اپنی سواریاں

باندھا کرتے تھے، انبیاء کرام کی نمازیں پڑھنے کی روایت، بیت المقدس میں مالکِ داروغہ دوزخ سے ملاقات، سدرۃ المنتہیٰ تک عروج اور اس کی صفت، چار نہروں کا ذکر، سدرۃ المنتہیٰ سے آگے 'مقام صرصر اقلام' تک پہنچنا، واپسی میں حضرت جبریل علیہ السلام کی اصل صورت کا دیدار، پانچ نمازوں کی پچاس نمازوں کے برابر قیمت و اجر، سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی بشارت وغیرہ۔ ان جزوی اضافوں کے علاوہ تمام بنیادی مضامینِ اسراء ومعراج احادیث ابن اسحاق اور احادیثِ صحیحین وکتبِ حدیث مشترک ہیں۔

تقابلی مطالعہ سے امام ابن اسحاقؒ اور بعد کے امامانِ حدیث بالخصوص امام بخاریؒ کی احادیثِ اسراء ومعراج سے بعض دل چسپ اہم اور معنی آفریں نکات سامنے آتے ہیں:

۔سیرت امام ابن اسحاقؒ کے بیش تر راوی مکی دور کے ہیں اور ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قدیم ترین اور اہم ترین ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ مکی دور کے ضرور ہیں، لیکن وہ ان کے لڑکپن کا واقعہ ہے اور حضرت معاویہؓ اس وقت مسلم بھی نہ تھے، جس طرح حضرت ام ہانی بنت ابی طالبؓ غیر مسلم تھیں، اگرچہ وہ باشعور اور عمر دراز خاتون تھیں۔ تابعین کرام میں امام زہری، امام حسن بصری اور امام قتادہ رحمہم اللہ نے اپنی روایات مکی صحابہ کرام سے لی تھیں۔ مؤخرالذکر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مولیٰ اور شاگرد تھے اور مکی بھی تھے، مگر ان کے امام و شیخ حضرت ابن عباسؓ اس وقت نابالغ تھے۔ ان میں حضرت ابوسعید خدریؓ مدنی صحابی ہیں۔ انہوں نے متعدد دوسرے راویوں کی طرح مکی صحابہ کرام سے روایات لی تھیں۔

۔صحیحین بالخصوص بخاری کے مکی راویانِ کرام میں حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور ان کے بارے میں بھی وہی مشترکہ اوصاف وشواہد ہیں جو امام ابن اسحاقؒ کے رواۃ کے بارے میں اوپر آئے۔ ان میں سے ایک حضرت ابوذر غفاریؓ مکی دور کے صحابی راوی ضرور ہیں، لیکن وہ اسلام لانے کے بعد اپنے علاقہ بنوغفار میں قیام پذیر رہے تھے، البتہ مکہ مکرمہ آتے جاتے

رہتے تھے، مگر وہ اصل راوی نہیں ہیں۔انہوں نے تمام مدنی رواۃ کرام: حضرت مالک بن صعصعہ، حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی مانند مختلف مواقع پر مکی صحابہ کرام سے یا براہ راست رسول اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے احادیث اسراء ومعراج اخذ کی تھیں۔

۔مواقع و مقامات اور زمانے کے اختلاف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث راوی اول نے مختلف لوگوں سے بیان کیں، لہٰذا ان میں بیانیہ کا فرق ہو گیا۔

۔موضوعات و مضامین کے لحاظ سے روایتِ سیرت ابن اسحاق اور احادیث صحیحین وغیرہ یکساں ہیں، ان میں صرف جزوی اختلافات ملتے ہیں۔

۔زبان و بیان اور موضوعات و مضامین اور متعدد دوسری چیزوں کی وجہ سے احادیثِ اسراء ومعراج سیرت ابن اسحاق میں قدامت واولیت رکھتی ہیں۔

(باقی)

حواشی ومراجع

۱۹۔لیکن یہ حدیث صحیح المعانی ہے اور متعدد کتبِ سیرت میں متعدد طرق سے آئی ہے۔اسی وجہ سے حضرتِ موصوف کو صدیق یا صدیق اکبر کا لقب دربارِ نبوی سے عطا ہوا تھا۔۔مناقبِ صدیق کے لیے ملاحظہ کیجئے فتح الباری ۷/ ۱۱ وما بعد۔ حافظ ابن سید الناس، عیون الاثر ۱/ ۹۵ میں یہ حدیث موجود ہے، جسے معضل کہا گیا ہے۔صدیق کے لقب عطا کرنے کا ایک دوسرا موقعہ اسراء ومعراج کی صبح کا بتایا گیا ہے، جب حضرت ابوبکرؓ نے بلا جھجک اسے صحیح واقعہ تسلیم کرکے آپ کی تصدیق کی تھی۔

۲۰۔ اسلامِ حضرت عمرؓ میں حضرت نعیم کا ذکرِ خیر ان کے اسی لقب کے ساتھ آیا ہے۔ابن سعد (۴/ ۳۸۷) نے اپنی سند سے، جس کے آخری راوی حضرت ابوبکر بن عبداللہ بن ابی جہم عدویؓ ہیں، ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرکے ان کے تسمیہ النحام کی بابت حدیث نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''**لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: دخلت الجنة فسمعت نحمة من نعيم، فسمی النحام**۔۔''۔ یہ بلا شبہ مکی حدیث ہے کہ صحابی جلیل نے مدتوں بعد ہجرتِ مدینہ مکہ ہی میں قیام کیا تھا اور رسول اکرم ﷺ نے غالباً جنت میں ان کے نحمہ سننے کا مشاہدہ وتجربہ واقعہ اسراء ومعراج میں کیا تھا۔

۲۱۔ ابن سعد (۳/۱۲۱) کے مطابق حضرت حسن بصریؒ کی سند سے یہ حدیث مروی ہے۔

۲۲۔ ابن سعد (۳/ ۱۴۲۔ ۱۴۳) نے اس اولین دعائے نبوی کے الفاظ نقل کیے ہیں، جو یہ ہیں: ''**اللهم أعزّ الاسلام بعمر بن الخطاب أو بعمر وبن هشام**'' اور اس میں حضرت خبابؓ کا تاثر بھی موجود ہے۔امام ابن سعد کی یہ حدیث مرفوع ہے کہ ان کی سند سے حضرت انس بن مالک صحابیؓ سے مروی ہے۔وہ تمام ضروری نکات میں ابن اسحاق کی حدیث کی تائید کرتی ہے۔نیز ملاحظہ کیجئے ادریس کاندھلوی ۱/ ۲۵۸ و مابعد، مودودی، سیرت سرورعالم ۲/ ۶۰۸۔ ۶۱۲ ومابعد، فتح الباری ۷/ ۲۲۲۔ ۲۲۸، مسند احمد (حدیث: ۵۶۹۳ مسند حضرت ابن عمرؓ) میں دونوں اکابر قریش کے لیے دعائے نبوی کا ذکر ہے۔

۲۳۔مودودی (۲/ ۶۰۷) نے حضرت عمرؓ کے اس پہلے تاثر کی حدیث مسند احمد اور طبرانی سے نقل کی ہے، جس میں امام ابن اسحاق کی مذکورہ بالا روایت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے نماز میں سورہ الحاقہ کی تلاوت کی تھی، جس سے حضرت عمر اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے تھے۔ اپنے حاشیہ میں اس واقعہ کے لیے مسند ابن سنجر کا بھی حوالہ دیا ہے۔ مسند احمد (حدیث: ۱۰۸ مسند عمر بن خطابؓ) میں اس کی کافی تفصیل ہے اور وہ ابن اسحاقؒ کی روایت کے مماثل ہے۔ ابن اسحاق کی روایتِ یونس بن بکیر میں اسلام حضرت عمرؓ کے باب میں کئی قیمتی معلومات ہیں، جیسے محتاج صحابہ کو آسودہ حال صحابہ کی کفالت میں دینے کی سنتِ نبوی، حضرت خباب بن ارت تمیمیؓ حضرت سعید بن زید عدویؓ کے اسی طرح پروردہ تھے، حالاں کہ وہ بنوزہرہ کے ایک شخص کے حلیف تھے۔اس میں دعا وغیرہ کا ذکر ہے اور پورا واقعہ اسلام حضرت عمرؓ کا ہے۔(۱۱/۱۹۱۔۱۹۶)

۲۴۔بحث کے لیے کتابِ خاک سار 'مکی اسوہ نبوی' کی بحث 'انتخابِ دین کا حق'...جمیل بن معمر جمحی کا ذکر اور ان کے اسلام عمرؓ کے چرچا کرنے کا بیان ابن اسحاق میں خاصا افسانوی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبریں پھیلانے والے شری شخص تھے اور حضرت عمرؓ ان کو نہیں جانتے تھے، حالاں کہ وہ قبیلہ بنوجمح کے ایک بڑے سردار تھے اور بعد میں اسلام بھی لائے۔ان کے قبول اسلام اور سماجی منزلت کا ذکر کوئی سیرت نگار نہیں کرتا۔ ملاحظہ ہو اسد الغابہ/ اصابہ میں ان کا تذکرہ اور نسب قریش زبیری میں ان کا مقام ومرتبہ۔

۲۵۔کاندھلوی (۱/ ۲۵۰ و مابعد) اور سید مودودی (۲/ ۵۸۸ و مابعد) نے متعدد امامانِ حدیث کی کتابوں سے احادیث نبوی اس باب میں نقل کی ہیں، فتح الباری ۷/ ۲۴۰۔ ۲۴۱، احادیثِ

بخاری: ۳۸۷۷۔ ۳۸۸۱ (پانچ احادیث) میں ان کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھنے اور ان کے لیے استغفار کرنے کا ذکر ہے، جو امامِ ابن اسحاق کی روایت / روایاتِ سیرت کی تصدیق کرتی ہیں۔ مسند احمد حدیث: ۴۳۸٦ مسند ابن مسعودؓ میں نماز جنازہ کا ذکر ہے۔

۲٦۔ فتح الباری (۷ / ۲۳۷ و مابعد) میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن اسحاق کی اسی حدیث کو دوسرے الفاظ میں نقل کیا ہے: ''انّ بالحبشة ملكاً لايظلم عنده أحد، فلو خرجتم اليه حتى يجعل الله لكم خرجاً'' حافظ ابن سید الناس ۱/ نے امام زہری کی روایت معمر کے واسطہ سے مصنفِ عبدالرزاق سے بیان کی ہے، جس کے الفاظ ہیں: ''تفرّقوا في الأرض، فان الله سيجمعكم۔ قالوا: الى أين نذهب؟قال: الى هاهنا ،وأشاربيده إلى أرض الحبشة۔'' عیون الاثرا / ۱۵۱ و مابعد میں متعدد روایاتِ سیرت و حدیث ہیں۔ روایتِ یونس بن بکیر میں بعض دوسری احادیث بھی ہیں اور مختلف واقعات سیرت بھی۔ ۱۱ / ۱۷۵۔ ۱۷۸ نیز ۱۸۳ و مابعد۔)

۲۷۔ بخاری (فتح الباری ۷ / ۲۸۷۔ ۲۸۸ و مابعد) نے اسی سند سے حدیث بخاری (۳۹۰۵) کا اولین حصہ روایت کیا ہے اور بعد میں ہجرتِ مدینہ کا واقعہ بھی اس میں جوڑ دیا ہے۔ ان دونوں روایات میں بہت زیادہ مماثلت ہے اور حدیثِ بخاری میں بعض اضافات بھی ہیں۔ ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ایک عمدہ تحقیقی کام ہوگا۔

۲۸۔ مسند احمد (حدیث: ۳۸۲۲: مسند حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) میں وہ مرفوع مروی ہے اور اس کا ذکر محقق حمدی وغیرہ نے نہیں کیا ہے۔ بعض دوسروں نے ابن سعد کے حوالے سے بدقماشوں کے حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی ڈالنے اور کھینچنے کی تعذیب پر ان کے صرف 'أحد أحد' کہنے کی حدیث روایت کی ہے، جو امام ابن سعد کی اپنی سند سے حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے۔ امام حاکم کے نزدیک یہ صحیح الاسناد ہے، اگرچہ صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے اور امام ذہبیؒ نے بھی اس کی توثیق کی ہے (مستدرک ۳ / ۲۸۴)۔ روایت یونس بن بکیر میں یہ اضافہ بہت اہم ہے کہ ورقہ بن نوفل ان کو تسلی دیتے اور ان کی توحید پرستی کی تائید کرتے اور بنوجمح اور دوسرے ظالموں کو سمجھاتے کہ اس پر رحم کریں اور اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو اس پر میں نوحہ کرتا رہوں گا۔ (۱۱ / ۲۰۰)

۲۹۔ ابن سعد کی مذکورہ بالا حدیث میں کئی کم زور مسلمانوں کی تعذیب کا ذکر ہے۔ ان میں آل یاسر، خبابؓ اور صہیبؓ شامل تھے۔ ابن سعد (۳ / ۱۳۱ و مابعد) میں بھی اس حدیث کے دوسرے

الفاظ ہیں، مگر مفہوم یہی ہے۔ فتح الباری (۷/۲۰۹) میں موخر الذکر حدیث کو مختصراً ابن ماجہ، ابن حبان میں حضرت زِر بن مسعودؒ کے طریق سے مروی ہونا بتایا گیا ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے روایت یونس بن بکیر ۱۱/۲۰۰۔

۳۰۔ مسند احمد (احادیث: ۲۳۱۷، ۳۰۴۳، ۲۲۲۶، ۳۴۷۳ مسند حضرت ابن عباسؓ وغیرہ) میں ابوجہل کے بارے میں کئی واقعات کی احادیث ہیں، جو سورۂ علق کے حوالے سے ہیں اور ان میں حضرت جبریل علیہ السلام کے علاوہ ملائکہ کے پکڑ لینے کا ذکر ہے اور اونٹ کی جگہ آگ کی خندق کا۔

۳۱۔ سورۂ لہب کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''وہ مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گی۔'' مسند بزار میں ہے کہ آپ کو ایک فرشتہ نے چھپا لیا تھا۔ اس ضمن میں تفسیر میں مذکورہ سورۂ اسراء کی آیت ۴۵ و اذاقرأت القرآن الخ بھی بہت اہم ہے، جس کی تفسیر میں اور کئی احادیث و روایات ہیں۔ اسی اول سیرت کی حدیث کے لیے ملاحظہ کیجئے بخاری/ فتح الباری ۸/ ۹۴۳، کتاب التفسیر، جس میں مسند بزار کے علاوہ حمیدی، ابویعلی اور ابن ابی حاتم کی حدیث حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اسی مانند ہے اور حاکم کی حدیثِ حضرت زید بن ارقمؓ ہے۔ دوسری حدیث بخاری/ فتح الباری ۶۷۸ و مابعد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہے۔ دوسرے طرق بھی ہیں۔

۳۲۔ امام بخاری نے اس سورہ کا جو سبب نزول بیان کیا ہے وہ روایتِ ابن اسحاق کا مخالف ہے۔ امام بخاریؒ نے سورہ لہب، کتاب التفسیر میں کئی احادیث نقل کی ہیں (۴۹۷۱، ۴۹۷۲، ۴۹۷۳) جن سے واضح ہوتا ہے کہ کوہِ صفا سے اپنے مشہور خطبہ میں آپ نے تمام قریش کو دعوت دی تھی اور انہیں شدید عذاب سے ڈرایا تھا۔ فتح الباری (۸/ ۹۴۱ و مابعد) میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابولہب کی ابو طالب سے مخاصمت و نزاع میں ابو طالب کی حمایتِ نبوی کی روایت بھی نقل کر دی اور اسے ایک سبب نزول قرار دیا ہے۔ یہ بعثت سے قبل کا واقعہ ہے اور بعد بعثت اس کی عداوت کا ایک سلسلہ ہے۔ اس میں اس کی دوسری حرکاتِ ناشائستہ اور اقوالِ بیہودہ شامل ہیں۔ ان اسباب سے سورۂ مذکورہ نازل ہوئی تھی۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ حمالۃ الحطب سے مراد یہ ہے کہ وہ چغل خوری کرتی تھی اور قریشی مشرکین سے آپؐ کے بارے میں برائیاں کرکے آگ بھڑکاتی تھی۔ اسی طرح 'حبل من مسد' کی دوسری تعبیرات بھی ہیں۔ دراصل کسی آیت یا سورۃ کے اسبابِ نزول متعدد ہوتے ہیں۔ اسی حقیقت کی شاہد ابن اسحاقؒ کی دوسری حدیث/ شان نزول ہے، جو آگے آئی ہے کہ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھایا کرتی تھی (۲/ ۳۔۵) اس طرح دونوں میاں بیوی کی

مستقل مخاصمت وایذادہی کے واقعات اس سورہ کے نزول کا باعث بنے تھے۔ محقق نے دوسری شانِ نزول کو نظر انداز کر دیا۔ مسند احمد میں کوہ صفا کے خطبہ پر ابولہب کے اعتراض کو سببِ نزول بتایا گیا ہے۔ اس میں اور بھی واقعات واحوال کا ذکر ہے۔ السیر ۃ، مذکورہ بالا ۸۷ ومابعد۔

۳۳۔ فتح الباری (۸ / ۹۳۵) میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ شانِئَکَ سے مراد 'عدوّ ک' (آپ کا دشمن) ہے۔ ابن مردویہ نے اسے موصول کہا ہے۔ برائی کرنے والے (شانئک) کی تعیین میں محدثین (ناقلین) یا مفسرین ورواۃ نے اختلاف کیا ہے اور تین اکابرِ قریش کے نام لکھے ہیں: عاص بن وائل، ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط''۔ امام ابن اسحاق نے حتمی طور سے اول الذکر کا نام لیا ہے، لہٰذا ان کی روایت کو ترجیح حاصل ہے۔

۳۴۔ بخاری/ فتح الباری (۸ / ۹۳۴۔۹۳۶) میں تین احادیث ہیں۔ ان میں حدیثِ عائشہؓ (۴۹۶۵) میں 'آنیۃ کعدد النجوم' کا فقرہ ہے۔

۳۵۔ مزید ملاحظہ کیجئے بخاری/ فتح الباری ۸ / ۹۳۵۔۹۳۶۔)

۳۶۔ فتح الباری (۸ / ۹۳۷) کے مطابق امام ابن ابی حاتم نے اسے حدیثِ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ قریش کا قول اور تجویز ومصالحت کا معاملہ تھا، اگرچہ اس حدیث کے ایک راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔

۳۷۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر۔

۳۸۔ سیرت ابن اسحاق میں نضر بن حارث عبدری کی ایذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ایک باب ہے، جس میں مختلف اکابر قریش کی وجہ سے مختلف آیات کے اسباب نزول کی بحث آئی ہے (۱ / ۱۸۶۔۱۹۹) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور روسائے قریش کے درمیان مکالمات و مباحثات اور تفسیر سورۂ کہف کی خاصی طویل اور اہم بحث ہے جو اس دورِ مکی کے علمی اور فکری مجادلہ کے ساتھ یہودی علمی وفکری ارتقا یا مجادلہ کی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔

۳۹۔ ان تمام آیات کی تفسیری احادیث کے لیے ملاحظہ ہو ابن کثیر اور طبری وغیرہ۔

۴۰۔ علامہ ابن حجرؒ (فتح الباری ۷ / ۲۴۱۔۲۴۲) نے ابن اسحاقؒ اور موسی بنؒ عقبہ کی کتاب المغازی سے اس کی تفصیل دی ہے اور اس حدیث کا ذکر بھی کیا ہے اور ان دونوں اماموں اور ابن ہشام کی روایت کی بنا پر کیا ہے۔ بخاری (کتاب مناقب الانصار، باب تقاسم المشرکین علی النبی ﷺ، ۳۸۸۲) میں اس معاہدہ کا مقام 'خیف بن کنانہ' بتایا گیا ہے۔ اس پر حافظ ابن حجرؒ نے بحث کی ہے نہ دوسرے اہل سیر نے۔ مسند احمد (حدیث: ۷۱۹۹ مسند ابی ہریرہؓ) میں یہی روایتِ بخاری ہے اور اس مقام کو المحصب بتایا گیا ہے۔ کتبِ سیرت میں بالعموم شعب ابی طالب

یا شعب بنی ہاشم کو بہ طور پناہ گاہ بتایا جاتا ہے۔اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

۴۱۔متعدد احادیث میں درخت کو بلانے اور اسے اس کے مقام پر واپس بھیجنے کے معجزات کا ذکر ہے، اگر چہ ان کا تناظر دوسرا ہے۔اس طرح وہ اس معجزانہ واقعہ کے شواہد بن جاتے ہیں۔جیسے مسند احمد کی حدیث: ۱۱۷۰۲: مسند حضرت انس بن مالکؓ ۔اس کے راوی مدنی ہیں اور مقام ترسیل بھی دور مدینہ ہے، تاہم مکی واقعہ کی اولین ترسیل سے ماخوذ ہے، یعنی حضرت انسؓ نے کسی مکی راوی سے ہی اسے اخذ کیا تھا۔

۴۲۔نقد محقق صرف اسناد وروایت کی بنا پر ہے کہ وہ ایک تابعی سے مروی ہے اور صحابی کا نام اس کی سند میں موجود نہیں، حالاں کہ حضرت عروہؒ امام حدیث بھی ہیں۔

۴۳۔ یہ واقعہ کافی طویل ہے۔اسے امام بیہقیؒ نے کتاب الدلائل میں، حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اور امام طبرانیؒ نے اوسط میں بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ اسے امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے۔ان تینوں اکابرِ قریش کا اتفاق تھا کہ آپؐ سچے رسول ہیں لیکن وہ اپنی خاندانی عصبیت اور کفر سے محبت کی وجہ سے اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ابوجہل مخزومی کے اعترافِ حق کا ذکر ان روایات واحادیث کے علاوہ ابن ابی حاتم کی ایک روایت ملتا ہے کہ اس نے ایک ملاقات میں، جو سرراہ ہوگئی تھی، آپؐ سے مصافحہ کیا۔ایک عینی شاہد نے بعد میں ابوجہل سے شکوہ کیا کہ آپ نے اس 'صابی' سے مصافحہ کیوں کیا۔ابوجہل نے اعتراف کیا کہ وہ رسولِ صادق ہیں، لیکن ہم بنو عبد مناف کی اتباع نہیں کرسکتے۔اس کی یہ خاندانی عصبیت ابن اسحاق، طبری اور بعض دوسری روایات میں سامنے آتی ہے۔

۴۴۔ابن ہشام، طبری اور بیہقی نے امام ابن اسحاق کی حدیث نقل کی ہے اور مسندِ احمد میں امام احمد نے اسی سند سے اس کو بیان کیا ہے۔

۴۵۔مسند احمد میں یہ تمام احادیث ایک مسلسل باب کی صورت میں جمع کردی گئی ہیں (السیرۃ، شمارہ ۲۳، ربیع الاول ۱۴۳۱ھ، ۴۹۔۶۸)

۴۶۔حضرت ام ہانیؓ کی روایت کا ابتدائی حصہ خاصا عجیب وغریب ہے کہ سفرِ اسراء ان کے گھر سے شروع ہوا، دوسرے نماز عشاء اور نماز فجر کے ذکر سے بھی خلجان پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت تک نماز پنجگانہ میں سے یہ دونوں فرض نہ تھیں۔تیسرے حضرت ام ہانیؓ اس وقت تک اسلام نہ لائی تھیں ۔چوتھے تمام احادیثِ صحیحین وغیرہ میں آغاز اسراء کا مقام حجر/کعبہ بتایا جاتا ہے یا آپ کے گھر کا بستر مبارک۔اس پر بحث وتحقیق کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

بحث ونظر

سیاستِ شرعیہ: مفہوم، مقصد اور دائرۂ کار
(امام ابن تیمیہؒ کے افکار کا مطالعہ)

______ مولانا محمد جرجیس کریمی

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی ایک اہم کتاب 'السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ' ہے۔ اس میں انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی سیاست کی توضیح وتشریح کی ہے۔ اس مضمون میں اسی کتاب کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے سب سے پہلے درج ذیل آیات سے والیانِ حکومت کی مدد ونصرت پر استدلال کیا ہے:

إِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَن تُؤَدُّوا الأَمَٰنٰتِ إِلَیٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَیْ نَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللّٰہَ كَانَ سَمِیعاً بَصِیراً۔ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَطِیعُواْ اللّٰہَ وَأَطِیعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِی الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْ فَرُدُّوهُ إِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَیْ رٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلاً (النساء: ۵۸-۵۹)

(مسلمانو!) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقینا اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر

تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسول
کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔
یہی ایک صحیح طریقۂ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ علماء نے ان آیات کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے پہلی آیت حکم رانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کریں اور جب فیصلہ کریں تو انصاف کی ساتھ کریں اور دوسری آیت رعایا اور ماتحت فوجیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ اولوالامر کی اطاعت کریں، الّا یہ کہ وہ اللہ کی معصیت کا حکم دیں تو ایسی صورت میں اطاعت واجب نہیں ہے۔امام موصوف کے نزدیک امانتوں کو ان کے اہل کے حوالہ کرنا اور عدل وانصاف کے مطابق فیصلے کرنا سیاستِ عادلہ اور صالح حکومت کی بنیاد ہے۔(ص۶)

امام ابن تیمیہؒ امانت کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں: ایک مناصب اور دوسری اموال۔ پہلی قسم کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے خانۂ کعبہ کی کنجی بنوشیبہ کے سردار عثمان بن طلحہ سے طلب فرمائی اور اس میں داخل ہوکر نماز پڑھی، اس وقت حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے آپؐ سے گزارش کی کہ کعبہ کی کنجی مجھے عطا کردی جائے۔اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حکم رانوں پر واجب ہے کہ وہ سرکاری مناصب مستحقین کو عطا کریں اور محبت وقرابت کی بنا پر کسی کو والی نہ بنائیں۔ نہ ایسے شخص کو کوئی عہدہ دیں جو خود اس کا طالب ہو اور نہ شفقتِ پدری کی بنیاد پر کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں اور نہ مستحق کو نظر انداز کرکے غیر مستحق کو کوئی عہدہ دیں۔ ان امور کے ضمن میں انھوں قرآن وحدیث کی مختلف نصوص کا حوالہ دیا ہے(ص ۷)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ جس نے سب سے زیادہ حق دار اور اہل کو منصب دینے سے اعراض کیا اور کسی نااہل کو منصب عطا کردیا، چاہے اس کی کوئی بھی وجہ ہو، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے ساتھ خیانت کی۔وہ لکھتے ہیں کہ کوئی بھی

منصب ہو، اسے سب سے زیادہ موزوں شخص کو دیا جائے گا۔ لیکن اگر موزوں شخص نہ مل سکے تو اس صورت میں جس قابلیت کا آدمی میسر ہو، اس پر اکتفا کیا جائے گا۔ (ص ۱۲)

انھوں نے اہل شخص کے انتخاب کے لیے بنیادی طور پر دو شرائط بیان کی ہیں: پہلی شرط ہے قوت اور دوسری ہے امانت (القصص: ۲۶، یوسف: ۵۴) طاقت و قوت کی ضرورت ہر منصب اور محکمے کے مطابق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لشکر کی امارت و سرداری کے لیے دل کی بہادری، لڑائی کی مہارت، جنگی حیلہ سازی اور چالاکی و ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تیراندازی، گھڑسواری، حربی طور طریقے جاننا بھی ضروری ہوتا ہے، جب کہ محکمۂ عدالت کے لیے قاضی کی قوت، عدل و انصاف کے تقاضوں سے واقف ہونا، کتاب و سنت کے دلائل کو جاننا، احکام نافذ کرنے کی صلاحیت رکھنا اور خوفِ خدا اور تقویٰ سے متصف ہونا ہے (ص ۱۳۔ ۱۴)

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ صلاحیت لوگوں میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر بن خطابؓ کہا کرتے تھے کہ ''اے اللہ! میں فاجر کی چستی و چالاکی اور ثقہ کے عجز و بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں''۔ ہر منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہے جو اس کے مناسبِ حال ہو، جیسے جنگ کے موقع پر سپہ سالار بنانے کے لیے فاجر، لیکن بہادر شخص کو متقی، لیکن کم زور پر ترجیح دینی چاہیے، کیوں کہ فاجر قوی کی قوت کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچے گا اور اس کے فجور کا نقصان صرف اس کی ذات کو لاحق ہوگا، جب کہ صالح ضعیف کا صلاح و تقویٰ اس کی ذات کے لیے منفعت بخش ہوگا، لیکن مسلمانوں کے لیے اس کا ضعف ہلاکت خیز ہوگا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس حوالے سے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا حوالہ دیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالار بنایا، جب کہ حضرت ابوذرؓ کو کسی طرح کا منصب دینے سے منع کر دیا (ص ۱۵۔۱۶) اسی طرح آپؐ نے غزوہ ذات السلاسل میں حضرت عمر بن العاصؓ کو ان صحابہ پر امیر بنایا جو ان سے افضل تھے، تاکہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو

اسلام کی طرف مائل کرسکیں۔ آپؐ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ان کے والد کی شہادت کا انتقام لینے کے لیے امیر لشکر بنایا اور بہت سے جلیل القدر صحابہ کو ان کی قیادت میں روانہ کیا۔ آپؐ کا معمول تھا کہ کبھی کسی شخص کو کسی مصلحت کی بنا پر سپہ سالار بنادیتے تھے اور اکابرِ صحابہ کو اس کے ماتحت کردیتے تھے، جو علم وعمل میں اس سے فائق اور افضل ہوتے تھے۔ انہی مصلحتوں کی وجہ سے مرتدین کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالار بنائے رکھا، باوجود اس کے کہ ان سے چند غلطیاں سرزد ہوگئی تھیں، لیکن ان کو معزول نہیں کیا (۱۵۔۱۶)

امام موصوف نے آگے وضاحت کی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کو متضاد اخلاق واوصاف کے حاملین کی ضرورت ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر وہ خود نرم مزاج ہوتو نائب سلطنت کو ایسا ہونا چاہیے جو شدت کی طرف مائل ہو اور اگر خلیفہ المسلمین کے مزاج میں شدت اور غضب ہوتو اس کے نائب کو نرم دل ہونا چاہیے، تاکہ دونوں کے امتزاج سے اعتدال پیدا ہوجائے۔ (ص ۱۷)

وہ فرماتے ہیں کہ ولایت وحکم رانی کا بنیادی مقصد خلقِ خدا کے دین کی اصلاح ہے۔ پس اگر لوگوں کا دین برباد ہوتو ان کا نقصان وخسران ہلاکت آفریں ہوگا اور نتیجہ کے طور پر دنیا کی نعمتیں ان کو کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی۔ دنیاوی امور، جن کے بغیر لوگوں کا دین قائم نہیں رہ سکتا، دوطرح کے ہیں: مستحقین میں مال تقسیم کرنا اور اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو سزائیں دینا۔ جو شخص حق سے تجاوز نہ کرے اور اعمال زندگی میں اعتدال کا راستہ اختیار کیے رہے، اس کے دین ودنیا دونوں کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ صوبوں کی رعایا کو لکھ بھیجتے تھے کہ: ''میں نے اپنے عمّال کو تمہاری طرف اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ تم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تعلیم دیں اور تم لوگوں میں خراج اور مال غنیمت تقسیم کریں''۔ پس جب کسی وجہ سے راعی اور رعایا میں تغیر آجائے تو نظام حکومت بگڑ جاتا ہے۔ (ص ۱۸)

امورِ دین میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم نماز ہے۔ نبی ﷺ نے

حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو فرمایا: ''اے معاذ! میرے نزدیک سب سے اہم اور ضروری کام نماز ہے۔'' حضرت عمر بن الخطابؓ اپنے عمّال کو لکھا کرتے تھے کہ ''میرے نزدیک سب سے اہم کام نماز ہے۔ جس شخص نے اس کی حفاظت کی، اس نے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کردیا وہ دین کے دیگر احکام کو پامال کرنے میں زیادہ دلیر ہوگا۔'' (۲۰۔۲۱)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ ولایات (سرکاری مناصب) کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اللہ کا دین قائم ہو اور اس کا کلمہ بلند ہو۔ 'کلمۃ اللہ' ایک جامع لفظ ہے، جس میں پوری شریعت شامل ہے۔ رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ عدل وقسط کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کریں۔ (ص ۲۲)

اس وضاحت کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (الحدید:۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہوجائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسول کی مدد کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اس ٹکڑے میں فرمایا ہے کہ جو کتاب سے ہٹے گا اس کو 'حدید' یعنی تلوار کے ذریعہ سیدھا کیا جائے گا۔ چنانچہ اس دین کے قائم کرنے کا ذریعہ اللہ کی کتاب اور تلوار ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ''جو کتاب اللہ سے ہٹے اسے ہم تلوار سے ضرب لگائیں۔'' پس جب اقامتِ دین مقصود ہے تو سرکاری مناصب کو دینے میں انہی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا کہ حسبِ مراتب جو زیادہ دینی احکام اور تعلیمات کا پابند ہو اسی کو منصب اور حکم رانی دی جائے گی۔

امانت کی دوسری قسم مال ہے، جسے اس کے مستحقین کو ادا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِیْ اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ(البقرۃ: ۲۸۳)

اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کرکے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے۔

اس مال میں اعیان، قرض، ہبہ، شراکت، وکالت، مضاربت، مالِ یتیم، اوقاف، قرض کی ادائیگی، عورتوں کا مہر اور اجرتیں وغیرہ شامل ہیں۔ امام موصوف نے اس طرح کے اموال کی ادائیگی کو امانت کی ادائیگی قرار دیا ہے اور قرآن وحدیث سے متعدد نصوص بہ طور دلیل نقل کی ہیں۔ انھوں نے مال مسروقہ مغصوبہ اور خیانت کے مال کی واپسی، اس طرح عاریت میں لیے ہوئے مال کی واپسی کو بھی امانت میں شمار کیا ہے، جس کا ادا کرنا واجب ہے اور اس کے مخاطب حکم راں اور رعایا دونوں ہیں۔ چنانچہ حکمراں اور ان کے نائبین پر ضروری ہے کہ صاحب حق کا حق ادا کریں۔ اسی طرح ٹیکس وصول کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خزانے میں مال جمع کردیں۔ علیٰ ھذا القیاس رعایا پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے حقوق ادا کردیں اور ایسے مال کا مطالبہ نہ کریں جس کا انہیں حق نہیں ہے اور نہ یہ مناسب ہے کہ بادشاہِ وقت کے حقوق کو ادا کرنے سے رکیں، اگرچہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو اور سرکاری اہل کاروں کے لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ مال کی تقسیم ادنی خواہشات کے مطابق کریں، کیوں کہ وہ مال کے مالک نہیں، بلکہ امانت دار ہیں (ص ۲۴۔۲۶) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **انی واللّٰہ لا أعطی أحدًا ولا أمنع أحدًا، وانما أنا قاسم، أضع حیث أمرت (البخاری)** ''بے شک میں از خود نہ کسی کو دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، بلکہ میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں، میں وہی کرتا ہوں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے''۔ جب نبی ﷺ کو کسی کو مال دینے یا نہ دینے کا اختیار نہیں تھا تو ظاہر بات ہے کہ عام حکم رانوں کو یہ اختیار کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین نے نبی ﷺ کی اسی سنت پر عمل کیا اور مال اس کے مستحقین ہی کو دیا۔ اس کی تائید میں امام

موصوف نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اقوال نقل کیے ہیں (ص ۲۶)

قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق سرکاری شاہی خزانے کی آمدنی کے ذرائع مالِ غنیمت، اموالِ زکوٰۃ اور مالِ فیی ہیں۔ مالِ غنیمت کفار سے جہاد کے ذریعے حاصل شدہ مال کو کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں مالِ غنیمت کو امت مسلمہ کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے۔ امام موصوف نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں قرآنی احکام بیان کیے ہیں۔ ساتھ ہی مزید کچھ تفصیلات بیان کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو مالِ غنیمت کی تقسیم میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ (ص ۲۸-۲۹)

مال کی دوسری قسم اموالِ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ انہی لوگوں میں تقسیم کی جائے گی جن کا ذکر قرآن مجید میں مداتِ زکوٰۃ کو بیان کرنے والی آیت میں ہوا ہے۔ (التوبۃ:۶۰) مزید اس میں کسی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور مال زکوٰۃ کا سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں نبی یا کسی اور کو اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس نے خود تقسیم کردی ہے۔ اگر تم ان آٹھ لوگوں میں سے ہو جن کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے تو تمہیں زکوٰۃ دی جائے گی، ورنہ نہیں۔'' (ص ۳۲)

مال کی تیسری قسم مال فیی ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ حشر آیت ۷ میں ہوا ہے۔ یہ اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے بغیر لڑائی کے حاصل ہو۔ اس کو فیی اس لیے کہا جاتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مال کو کفار سے لے کر مسلمانوں کی طرف لوٹا دیا ہے۔ مال فیی کی مثال جزیہ کی ہے، جو یہود ونصاریٰ پر واجب ہوتا ہے اور اس مال کی مثال ہے جو دشمنوں سے مصالحت کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، یا کوئی حکم راں خلیفۃ المسلمین کو دیتا ہے، یا اس کی مثال اس مال کی ہے جو حربی یا ذمی تاجروں سے وصول کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ عہد توڑنے والے سے وصول کرتے تھے، یا اس خراج کی طرح ہے جو لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اس طرح مال فیی کی تعریف میں تمام سرکاری

اموال شامل ہیں۔مسلمانوں کے بیت المال میں اس مال کو جمع کیا جائے گا جس کا کوئی متعین مالک نہ ہو، جیسے کسی مسلمان کا انتقال ہوگیا اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، یا مغصوبہ مال جس کا اصل مالک موجود نہ ہو، یا عاریت میں لیا ہوا مال، یا ہبہ میں دیا ہوا مال جس کے مالک کا پتہ نہ ہو، چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، یہ سب سرکاری مال شمار ہوں گے۔

اموال کے مصارف کے سلسلے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو مصلحت سے قریب تر ہو اور جس سے نفع کا امکان زیادہ ہو۔ چنانچہ مال فیی درجہ بدرجہ مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے گا۔سب سے پہلے ان فوجیوں کو دیا جائے گا جو جہاد میں مصروف ہیں۔ اس لیے کہ مال فیی ان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔اسی وجہ سے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ مال فیی فوجیوں کے لیے مخصوص مال ہے۔ مستحقینِ مال فیی میں سرکاری عہدے دار، مثلاً گورنر، قضاۃ، علماء اور مال جمع کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے، حتیٰ کہ ائمہ ومؤذنین بھی شامل ہیں۔(ص ۴۲)اسی طرح اس مال کو ان مصارف میں خرچ کیا جائے گا جن کا نفع عام ہے، جیسے سرحد کی حفاظت، اسلحہ کی تیاری، راستوں، پلوں اور نہروں کی تعمیر وغیرہ۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حاکم وقت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کو اپنی خواہش پر یا قرابت ومودت کی بنیاد پر کوئی ممکنہ نفع حاصل کرنے کے ارادے سے مال دے، جیسے مخنثوں کو یا گانے بجانے والوں کو یا کرتب دکھانے والوں کو یا جوتشی اور قسمت بتانے والوں کو مال دیا جائے۔(ص ۴۲۔ ۴۳)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ مال فیی تالیفِ قلب کے لیے دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے مختلف واقعات سے پتا چلتا ہے۔اس ذیل میں دوطرح کے لوگ آتے ہیں: ایک وہ کافر جس کے اسلام لانے کی امید ہو، یا اس سے پہنچنے والے ممکنہ ضرر کو دفع کرنا مقصود ہو، دوسرا وہ مسلمان جس کے ذریعہ اس کے رابطے میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے اسلام لانے کی امید ہو، یا جس کے ایمان کی تقویت، یا ضرر کو روکنا مقصود ہو۔اس طرح کی تمام نوازشات بہ ظاہر مال داروں کو مال عطا کرنے اور کم

زوروں کو ترک کر دینے کے مترادف ہے، لیکن اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، چنانچہ اگر ان عطایا کے ذریعہ دین کی مصلحت مقصود ہے تو گویا یہ نبی ﷺ اور آپ کے خلفاء کے عطایا کے مثل ہیں، لیکن اگر اس کا مقصود زمین میں فتنہ وفساد پھیلانا اور برتری حاصل کرنا ہے تو اس کی مثال فرعون کے عطایا کی ہوگی۔ (ص ۴۴۔ ۴۵)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ افضل ایمان سخاوت اور صبر ہے۔ مخلوق کی رعایت جود وسخاوت اور صبر وشجاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ قرآن میں سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت، اس طرح شجاعت کی فضیلت اور بزدلی کی مذمت پر متعدد آیات وارد ہیں۔ انہوں نے حکم رانوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں: پہلی قسم ان کی ہے جو برتری اور زمین میں فتنہ وفساد کے طالب ہوتے ہیں، جو اپنی عاقبت کو نہیں دیکھتے، چنانچہ لوگوں سے ناجائز طریقے سے مال وصول کرتے ہیں اور ناجائز طریقے پر خرچ بھی کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان حکم رانوں کی ہے جن کے اندر اگرچہ اللہ کا خوف ہوتا ہے اور وہ خلقِ خدا پر ظلم کو حرام سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست کے تقاضے اس کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ وہ حرام کاموں میں شریک ہوجاتے ہیں اور فرائض کو ترک کر دیتے ہیں۔ تیسری قسم ان حکم رانوں کی ہے جن کا معاملہ مذکورہ دونوں قسم کے حکم رانوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ شریعت اسلامی کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ مال کو لوگوں کے نفع کے لیے حسب ضرورت خرچ کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود ان کے احوال کی اصلاح اور دین کی اقامت ہوتی ہے۔ یہ حضرات لوگوں سے مال کا ناجائز مطالبہ نہیں کرتے اور تقوی اور احسان کی روش پر قائم رہتے ہیں۔ (ص ۴۷۔ ۴۸)

امام موصوف لکھتے ہیں کہ سیاستِ دینیہ اس کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی اور دین و دنیا کی مصلحتیں اسی طریقے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے سیاست عادلہ کا حامل ان حکم رانوں کو قرار دیا ہے جو فرائض کو قائم کرتے ہیں، محرمات کو ترک کرتے ہیں، صرف ان کو عطا کرتے ہیں جن کو عطا کرنا دین کی مصلحت ہو اور صرف وہ لیتے ہیں جو ان کے لیے حلال ہو، جب محارم کا ارتکاب کیا جائے تو غضب ناک ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی

ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے، بلکہ معاف کردیتے ہیں۔(ص ۴۹۔۵۰)

سیاست شرعیہ کا دوسرا اساسی محل حدود کا قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النسائ:۵۸)

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

لوگوں کے درمیان فیصلے دو چیزوں میں ہوتے ہیں: ایک حدود، دوسرے حقوق۔ ان کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم ان حدود و حقوق کی ہے جن کا تعلق کسی معین قوم سے نہ ہو، بلکہ اس کی منفعت بلا تخصیص عام مسلمانوں (یا انسانوں) کو پہنچتی ہو اور سب کے سب ان منفعتوں کے حاجت مند ہوں۔ ان فیصلوں کو 'حدود اللہ' کہتے ہیں، جیسے چوروں، ڈاکوؤں یا زانیوں پر حد شرعی نافذ کرنا، یا جیسے سرکاری اموال یا اوقاف یا ان وصیتوں کے نزاعات کا فیصلہ کرنا جو کسی معین شخص کے لیے نہ کی گئی ہوں۔ اس کو 'حقوق العباد' کہتے ہیں اور یہ حکومت و سیاست کے اہم امور میں سے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مسلمانوں پر کسی نہ کسی امیر یعنی حکم راں کا ہونا لازم ہے، خواہ وہ نیک ہو یا فاجر۔ ان سے پوچھا گیا کہ نیک اور انصاف پسند حکم راں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن فاجر حاکم سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ "اس کے ذریعہ بھی حدود شرعیہ قائم ہوں گی، راستے پر امن رہیں گے، دشمن سے جہاد کیا جائے گا اور مال فیئ تقسیم ہوگا"۔(ص ۵۱)

یہ وہ قسم ہے جس کو وجود میں لانا اور اس کے قیام کے لیے کوشاں رہنا حکام پر واجب ہے، خواہ اس کے لیے کسی کی طرف سے دعوی کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حد جاری کرنے میں شریف وغیر شریف اور قوی وضعیف کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ حاکم کے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ کسی کی سفارش پر یا ہدیہ قبول کرکے حد جاری کرنے میں لیت ولعل کرے۔ جو شخص حد جاری کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کے باوجود حد کو معطل کردے، اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔(ص ۵۱)

امام موصوف آگے لکھتے ہیں کہ یہ بھی جائز نہیں ہے کہ زانی، چور، شرابی اور

ڈاکو سے مال لے کر حد معطل کردی جائے، چاہے وہ بیت المال کے لیے ہی کیوں نہ لیا گیا ہو۔ اس طرح لیا ہوا مال سخت حرام ہے اور ایسا کرنے والا حاکم دو فسادوں کو جمع کرنے والا کہلائے گا: ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حدود کو معطل کرنا اور دوسرا حرام خوری۔ (ص ۵۵)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ جب حاکم وقت رشوت کھائے گا تو لازماً وہ جھوٹ سنے گا، جو کہ 'شہادۃ زور' میں سے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے رشوت لینے والے، دینے والے اور دلانے والے، سب پر لعنت کی ہے۔ انھوں نے عہد نبوی کے ایک شخص کے بیٹے کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے ایک عورت سے زنا کیا تھا۔ لوگوں نے اس کو بتایا کہ تمہارا بیٹا سنگ سار کیا جائے گا، چنانچہ سنگ ساری سے بچنے کے لیے اس نے عورت کے شوہر کو سو بکریاں اور ایک خادم دیا۔ بعد میں جب اس نے براہ راست نبی ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے بکریاں اور خادم واپس کرنے کا حکم دیا اور اس پر حد جاری کرنے کا فرمان جاری کیا۔ ساتھ ہی اس عورت پر بھی، جس سے اس لڑکے نے اس کے مرضی سے زنا کیا تھا، حد جاری کرنے کا حکم دیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے معاملات میں جو فساد رونما ہوتا ہے وہ مال و منصب کے ذریعہ حد کو معطل کر دینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حاکم وقت اقامت حدود اور منکرات پر نکیر کرنے کو مال لے کر ترک کر دے تو یہ چیز بدکاری پر دلالی کرنے کے مثل ہوگی، کیوں کہ حکومت کی بنیادی ذمہ داری معروف کا حکم دینا اور منکر کو روکنا ہے، پس جب وہ اس کو انجام نہ دے تو گویا یہ ایسے ہی ہوا کہ جس کا کام دشمنوں کی مخالفت کرنا تھا اسی نے دشمنوں کی حمایت کی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ گویا اس نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مال لیا اور اس کے ذریعے مسلمانوں سے جنگ کی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بندوں کی صلاح امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ہے اور اسی میں اس کی معاش و معاد کی فلاح ہے۔ (ص ۵۸)

وہ رقم طراز ہیں کہ امر بالمعروف میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت،

والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، اہل وعیال کے ساتھ حسن معاشرت، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، سب مراد ہیں۔ حاکم وقت پر واجب ہے کہ ان سب باتوں کا حکم دے اور ان کے ترک کرنے والے کو سزا دے۔ اگر ان کی تارک پوری جماعت ہو تو اس سے قتال کرے۔ اسی طرح محرمات کے مرتکب، فتنہ وفساد کے خوگر اور منکرات انجام دینے والے سے بھی قتال کیا جائے گا، یہاں تک کہ پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ (ص ۵۹)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کا ایک حصہ باغیوں اور ڈاکوؤں کو سزا دینا ہے، جو راستوں میں اسلحے کے ذریعے سے لوگوں کے مال چھین لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> إِنَّمَا جَزَآؤُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الأَرْضِ فَسَاداً أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْ □ دِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِيْ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (المائدۃ: ۳۳)
>
> جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ زمین میں فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا جلاوطن کردیے جائیں۔ یہ ذلت ورسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بری سزا ہے۔

امام شافعیؒ حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ ڈاکوؤں نے اگر لوگوں کا قتل کیا ہو اور مال لوٹا ہو تو ان کو قتل کیا جائے گا اور سولی دی جائے گی اور اگر انھوں نے قتل کیا اور مال نہ لوٹا ہو تو ان کو قتل کیا جائے گا، سولی نہیں دی جائے گی۔ اور اگر انھوں نے مال لوٹا ہو اور کسی کا قتل نہ کیا ہو تو ان کے ہاتھ پیر مختلف سمتوں سے کاٹے جائیں گے۔ اور اگر انھوں نے راستوں کو پرخطر بنا دیا ہو، لیکن مال نہ لوٹ سکے ہوں تو انھیں جلاوطن کردیا جائے گا''۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہی موقف متعدد فقہاء کا ہے

، جیسے امام شافعی، امام احمد، اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ (ص ۶۲)

جہاں تک باغیوں کا سوال ہے جو لوگوں کو مال لوٹنے کے لیے قتل کرتے ہیں، ان کا ضرر عام ہے اور وہ چوروں کے مثل ہیں۔ ان کا قتل اللہ کی طرف سے مقررہ حد شمار ہوگا۔ یہ فقہاء کے درمیان متفق علیہ مسئلہ ہے، یہاں تک کہ اگر قاتل مقتول کے ہم رتبہ نہ ہو، مثلاً قاتل آزاد ہو اور مقتول غلام، یا قاتل مسلمان ہو اور مقتول ذمی یا مستامن تو اس صورت میں بھی اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ اگر باغیوں کی پوری جماعت ہو اور ان میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہو اور باقی لوگ اس کے مددگار ہوں تو جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ سب کو قتل کیا جائے گا، اگرچہ ان کی تعداد سو ہو۔ یہی خلفاء راشدین کا طریقہ رہا ہے۔

تمام قسم کے باغیوں اور ڈاکوؤں پر جب قدرت حاصل ہو جائے، وہ گرفت میں آ جائیں اور حاکم وقت ان پر حد قائم کرنا چاہے اور وہ اسے نہ قائم ہونے دیں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کے خلاف قتال کریں، یہاں تک کہ ان کو مکمل طریقے سے قابو میں کیا جا سکے۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ اگر وہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں تو ان سے قتال کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اگر ان کے قتل کی نوبت آ جائے تو قتل بھی کیا جائے گا، چاہے انہوں نے خود کسی کا قتل نہ کیا ہو۔ مزید یہ کہ اس کے خلاف بھی قتال کیا جائے گا جو ان کی حمایت کرے اور ان کو مدد پہنچائے۔ ان لوگوں سے قتال کرنا ان تمام گروہوں سے قتال سے زیادہ ضروری اور مؤکد ہے جو شرائع اسلام سے سرتابی کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے جان و مال اور کھیتی و نسل کو نقصان و تباہ کرنے کے لیے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں۔ ان کی مثال ان فتنہ پردازوں کی سی ہے جنہوں نے کسی قلعہ یا غار یا پہاڑ کی چوٹی یا کسی وادی میں پناہ لے رکھی ہو اور وہ وہاں سے گزرنے والوں پر لوٹ مار کرتے ہوں اور جب ان سے کہا جائے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کر دیں تو وہ قتال پر آمادہ ہو جاتے ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ان سے قتال کفار سے قتال کے مانند نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا مال (مال غنیمت کے طور پر) نہیں لیا جائے گا، الّا یہ کہ انہوں نے دوسروں کا مال لوٹا ہو تو ان سے تاوان وصول کیا جائے گا۔ ان سے قتال کا بنیادی مقصد

اقامتِ حد اور ان کو فساد انگیزی سے روکنا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فرار ہو جائے تو اس کا تعاقب نہیں کیا جائے گا، الّا یہ کہ اس پر حد واجب ہو۔ ان میں جو قید کرلیا جائے اس پر حد جاری ہوگی۔ اگر یہ غارت گر اسلام کے دشمنوں سے مل جائیں اور اسلامی فوج سے مقابلہ کریں تو ان سے کفار سے قتال کے مثل معاملہ کیا جائے گا۔(ص ۶۹۔ ۷۰)

مظلوموں کے لیے جائز ہے کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے محاربین اور ڈاکوؤں سے جنگ کریں، کیوں کہ شریعت میں جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، البتہ اگر ان غارت گروں کا مقصد محض مال حاصل کرنا ہو اور کچھ مال دے کر ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن ہو تو ایسا کرنا جائز ہے، لیکن عزت و آبرو ان کے حوالے کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ (ص ۷۱۔ ۷۲)

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حاکمِ وقت کے لیے یہ جائز نہیں کہ مال داروں سے اس کام کی اجرت وصول کریں کہ وہ رہ زنوں اور ڈاکوؤں کو پکڑیں گے اور ان پر حد قائم کریں گے، بلکہ ان کی تلاش اور سرکوبی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور اس کے مصارف بیت المال سے ادا جائیں گے۔ (ص ۷۲۔ ۷۳)

جس شخص نے کسی محارب، چور یا قاتل کو پناہ دی، یا اس کی حمایت کی تو وہ بھی جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اور اگر علم رکھنے والا شخص مطلوبہ شخص یا مال کی نشان دہی کرنے سے گریز کرے تو اس کو قید کی سزا دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اس کی اطلاع کرے، اس لیے کہ اس نے ایک حق کی ادائیگی میں، جو اس پر واجب تھا، پہلو تہی کی، لیکن یہ واضح رہے کہ اس کو اسی وقت سزا دی جائے گی جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کو مطلوبہ شخص یا مال کے بارے میں علم ہے۔ اس کو اس کی وجہ سے سزا نہیں دی جائے گی کہ اس نے بذاتِ خود خیانت کی ہے۔ (ص ۷۳)

مجرم پر جرم ثابت ہونے یا اس کا اقرار کرنے کے بعد سزا کے نفاذ میں تاخیر کرنا درست نہیں ہے اور نہ مجرم کو قید کرنا اور سزا کے بدلے میں اس سے مال لینا جائز ہے، بلکہ حد قائم کرنی ہی ضروری ہے۔ کیوں کہ اقامتِ حدود جہاد کی طرح عبادات میں

سے ہے۔ اسے قائم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ جان لیں کہ اقامتِ حدود اللہ کی طرف سے بندہ پر رحمت ہے۔ حاکم وقت کو اقامتِ حد کے سلسلے میں سخت ہونے کی ضرورت ہے۔ اسے چاہیے کہ بے جا انسانی ہمدردی کے جذبے سے حدود کو معطل نہ کردے، جس طرح باپ اپنے بچے کو ادب سکھانے کے لیے مارتا، یا معالج اپنے مریض کو بیماری سے شفا دینے کے لیے ناگوار دوا پلاتا ہے، اسی طرح حاکمِ وقت اپنی رعایا پر حدود قائم کرکے ان کو منکرات سے بچاتا ہے۔ جب اس کا مقصد محض اللہ کی رضا جوئی ہو تو اللہ تعالی اس کے لیے لوگوں کے دلوں کو نرم کردے گا، لیکن اگر اس کا مقصد بڑائی وبرتری کی طلب یا حصولِ مال ہو تو اس کا نتیجہ بھی برعکس ظاہر ہوگا۔ (ص ۷۹۔ ۸۰)

چوری کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے۔ اس کا حکم قرآن کریم (المائدہ: ۳۸) میں دیا گیا ہے۔ چور کا ہاتھ اس وقت کاٹا جائے گا جب اس نے نصاب کے بقدر چوری کی ہو (نصاب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے)۔ اسی طرح یہ سزا اس وقت دی جائے گی جب چور نے محفوظ مال چوری کیا ہو، لیکن اگر اس نے ضائع ہونے والے مال کو لیا ہو، یا ایسے درخت کا پھل توڑا ہو جو صحرا میں بغیر احاطے کے تھا، یا ایسے چوپائے کو چرایا ہو جس کا کوئی چرواہا نہ ہو، تو اس میں قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ ایسا کرنے والے کی تعزیر کی جائے گی اور مسروقہ مال پر دوگنا جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ (اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے) جہاں تک جیب کتروں کا سوال ہے تو ان کو بھی صحیح قول کے مطابق ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ زنا کے جرم میں اگر زانی شادی شدہ ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ مرجائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ماعز بن مالک اسلمی، غامدیہ اور دو یہودیوں کو رجم کرنے کا حکم دیا تھا اور عہد نبوی کے بعد بھی لوگوں کو رجم کیا گیا۔ اگر زانی غیر شادی شدہ ہے تو قرآن کے بموجب اسے سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائے گا۔ بعض علماء شہر بدری کو واجب قرار نہیں دیتے۔ مجرم پر سزا کا نفاذ اسی وقت ہوگا جب چار گواہوں نے شہادت پیش کردی ہو، یا خود اس نے چار بار اقرار کیا ہو۔ بعض علماء کے نزدیک ایک بار کا اعتراف بھی کافی ہے۔ جہاں تک بدفعلی (عمل قوم لوط) کا

معاملہ ہے تو علماء کے نزدیک اس کی حد زنا کی حد ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے کم تر سزا دی جائے گی۔ صحابہ کا اس پر اتفاق ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے گا، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے سنن ابو داؤد کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم اگر دو افراد کو عمل قوم لوط کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔''

شراب نوشی کی سزا نبی کریم ﷺ کی سنت اور اجماعِ امت کے مطابق چالیس کوڑے ہیں۔ اگر کوئی شخص چوتھی مرتبہ شراب نوشی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک قتل کی سزا منسوخ ہے، لیکن حاکم وقت تعزیراً اسے نافذ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ شرابی نے چاہے تھوڑی شراب پی ہو یا زیادہ، علاج کی غرض سے پی ہو یا کسی اور مقصد سے، ہر حال میں اس کو سزا دی جائے گی اور یہ سزا اسی وقت نافذ کی جائے گی جب اس کا شراب پینا ثابت ہو جائے، یا وہ اس کا اعتراف کر لے۔ (ص ۸۶)

پاک دامن (محصن) پر الزام تراشی کی سزا قرآن، حدیث اور اجماع امت کے مطابق یہ ہے کہ الزام لگانے والے کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے، اگر اس پر جرم ثابت ہو جائے۔ (ص ۹۰)

جہاں تک ان معصیتوں اور گناہوں کا سوال ہے جن میں حد مقرر نہیں ہے، مثلاً حرام اشیائ، مردہ یا خون کھانا، زنا سے کم تر کسی پر الزام تراشی کرنا، غیر محفوظ مال کی چوری کرنا، امانت میں خیانت کرنا یا اوقاف اور مالِ یتیم کو ہڑپ کرنا، ملاوٹ کرنا، ناپ تول میں کمی وبیشی کرنا، جھوٹی گواہی دینا، رشوت لینا، قرآن وحدیث کے برخلاف فیصلہ کرنا، جاہلی طور طریق اختیار کرنا، بدعت کی دعوت دینا، وغیرہ، ان تمام صورتوں میں مجرم کی تعزیر کی جائے گی۔ حاکم وقت حسبِ مصلحت تعزیر کرے گا۔ اگر کسی کا گناہ زیادہ ہو اور وہ بہ اصرار اسے انجام دیتا ہو تو اس کی زیادہ تعزیر کی جائے گی، ورنہ کم تعزیر کی جائے گی۔ تعزیر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، اس کا تعین حکمراں کی صواب دید پر ہوگا۔ (ص ۹۱)

بعض فقہاء تعزیراً قتل کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسے وہ جاسوس جس نے دشمنوں کو

راز بتایا ہو، یا جادوگر وغیرہ۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اس کی دلیل میں بعض روایات پیش کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فسادی شخص کو جس کے فساد کو اس کے قتل کے بغیر نہ روکا جا سکے، قتل کر دیا جائے گا۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> **من أتاكم وأمركم جميع على رجل واحد، يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه۔** (مسلم)
>
> جو شخص تمہارے پاس آئے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ تمہاری جمعیت توڑ دے یا جماعت میں تفرقہ ڈال دے، جب کہ تمہارا معاملہ (حکومت کا) ایک آدمی پر متفق ہو چکا ہو تو اس کو قتل کر دو۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سزا کی دو قسمیں ہیں: اول وہ سزا جو گذشتہ جرم کے بدلے میں دی جائے، جیسے شرابی، رہ زن، چور پر حد جاری کی جاتی ہے۔ دوم وہ سزا جو مستقبل میں جرم سے روکنے کے لیے دی جائے، جیسے مرتد سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ (ص ۹۳۔ ۹۴)

وہ سزائیں جو اللہ اور اس کی رسول کی معصیت پر دی جاتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ سزا جس میں مجرم پر قدرت حاصل ہو، چاہے ایک ہو یا متعدد۔ اس پر مقررہ حد نافذ کی جائے گی یا تعزیر کی جائے گی۔ دوسری وہ سزا جو ایسے مجرم سے متعلق ہو جس پر جنگ کے بغیر قدرت حاصل نہ ہو۔ اس کی اصل جہاد ہے، جو کفار اور اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> **وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ** (الانفال: ۳۹)
>
> اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔

قرآن وحدیث میں جہاد کی فضیلت اور اس کی اہمیت سے متعلق بے شمار نصوص وارد ہیں۔ امام موصوف نے جہاد کی مختلف فضیلتیں بیان کرنے کے ساتھ اس کے مختلف مواقع کا تذکرہ کیا ہے۔ (ص ۹۶۔ ۹۷) وہ لکھتے ہیں کہ حکم راں جب لوگوں کے دین کی اصلاح کا اہتمام کریں تو اس سے خود ان کی اور رعایا دونوں کی اصلاح

ہوگی، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو دونوں کے معاملات خراب ہوں گے۔اسی وجہ سے قرآن وحدیث میں نماز، زکوٰۃ، صبر اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔(ص ۹۸۔ ۱۱۳)

حقوق العباد میں لوگوں کی جانیں ہیں ۔قرآن وحدیث میں جان کی حرمت پر بہت سی نصوص وارد ہیں۔قتل نفس کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماً (النسائ:۹۲)

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الّا یہ کہ اس سے چوک ہوجائے۔رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’’قیامت کے دن سب سے پہلے خون کا فیصلہ ہوگا۔‘‘(بخاری، مسلم)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے قتل نفس کی تین قسمیں بیان کی ہیں: قتل عمد، قتل شبہ عمد اور قتل خطا۔قتل عمد یہ ہے کہ قاتل مقتول کو بلا کسی گناہ کے (جس میں قتل کرنے کی سزا ہے) قتل کردے، چاہے تلوار کی دھار سے قتل کرے، یا کوئی وزنی چیز اس پر گرادے، یا اسے آگ میں جلادے، یا پانی میں ڈبودے، یا گردن دبادے، یا گردن میں پھندہ لگادے، یا زہر کھلادے، یا اس کے خصیے نکال دے، جس سے اس کی جان چلی جائے، غرض کہ قتل کا طریقہ چاہے جو اختیار کیا جائے، اگر قاتل نے مقتول کی جان لے لی ہو تو وہ قتل عمد کہلائے گا اور مقتول کے وارثین کو قاتل سے قصاص لینے، دیت لینے یا معاف کردینے کا اختیار حاصل ہوگا، جیسا کہ قرآن وحدیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے (ص ۱۱۴۔ ۱۱۵) قاتل کے علاوہ کسی دوسرے سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور نہ ایک مقتول کے بدلے کئی لوگوں کو قتل کیا جائے گا، الّا یہ کہ کئی لوگ قتل میں شریک ہوں۔ قتل شبہ عمد یہ ہے کہ قاتل نے مقتول کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کیا ہو، لیکن اس کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، جیسے اس نے مقتول کو لاٹھی ڈنڈے سے مارا، یا تھپڑ مارا، لیکن اس سے

مقتول کی جان چلی گئی تو اس کو قتل شبہ عمد کہا جائے گا۔ اس کی سزا دیت اور کفارہ ہے۔ قتل خطا یہ ہے کہ کسی شخص نے شکار پر تیر چلایا، لیکن وہ کسی انسان کو لگ گیا، جس سے اس کی جان چلی گئی۔ اس میں قصاص نہیں ہے، بلکہ دیت اور کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ (ص ۱۱۶۔ ۱۱۸)

زخموں میں بھی قصاص ہے۔ لیکن قصاص کی ایک بنیادی شرط مساوات ہے، یعنی جتنا گہرا زخم لگایا گیا ہے اتنا ہی گہرا زخم لگایا جائے گا۔ اگر مساوات کو ملحوظ رکھنا ممکن نہ ہو تو قصاص کے بجائے دیت لی جائے گی یا تعزیر کی جائے گی۔ (ص ۱۱۹)

ہتکِ عزت کا بھی بدلہ لیا جائے گا۔ چنانچہ اگر کسی نے کسی دوسرے کو ملعون کہہ دیا یا بد دعا دی یا برا بھلا کہا تو بدلے میں وہ بھی اسے ویسے ہی کلمات کہہ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسے کلمات کہے ہوں جن کا بولنا درست نہیں یا وہ جھوٹ پر مبنی ہوں ، جیسے کسی کی تفسیق و تکفیر کرنا یا ماں بہن کی گالی دینا تو بدلے میں اسی طرح کے کلمات ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔ (ص ۱۲۱)

جہاں تک میاں بیوی کے درمیان حقوق کا سوال ہے تو ہر ایک پر کچھ حقوق اور کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے ہر ایک پر واجب ہے کہ دوسرے کے حقوق بہ طیب خاطر اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرے۔ شوہر پر بیوی کے حقوق یہ ہیں: مہر، نفقہ اور حقِ مباشرت۔ اگر شوہر جماع پر قادر نہ ہو تو ان کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی اور شوہر کے لیے بیوی پر یہ حقوق ہیں: حق مباشرت، عورت کا گھر میں ٹک کر رہنا، البتہ شوہر کی اجازت سے اور شرعی ضرورت کے تحت وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

جہاں تک اموال کا معاملہ ہے تو اس میں عدل و انصاف کی پابندی ہوگی اور احکام شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم کی جائے گی۔ اسی طرح خرید و فروخت، اجارہ، وکالۃ، شراکت، ہبہ، اوقاف اور وصیت وغیرہ میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور ان تمام حرام طریقوں سے اجتناب کیا جائے گا جن کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ معاملات میں بنیادی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہی چیز حرام ہوگی جو کتاب و سنت میں حرام قرار دی گئی ہے اور عبادات میں وہی چیز مشروع

ہو گی جو قرآن وسنت سے ثابت ہو۔(ص ۱۲۳۔۱۲۴)

حاکم وقت کے لیے لوگوں سے مشورہ کے بغیر چارہ نہیں، جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

(آل عمران:۱۵۹)

اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے میں مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ:''رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب سے جتنا مشورہ کرتے تھے اتنا مشورہ کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا''۔رسول اللہ ﷺ کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا تاکہ ان کی تالیف قلب ہو اور بعد کے لوگ بھی اس کی اقتدا کریں۔

اگر مسلمانوں کے درمیان کسی مسئلے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے حل کے لیے انہیں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْ ءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْ رٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلا

(النسائ:۵۹)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اولوالامر دو طرح کے لوگ ہیں: حکمراں اور علمائ۔اگر یہ دونوں ٹھیک ہیں تو باقی لوگ بھی ٹھیک رہیں گے۔ان میں سے ہر ایک پر واجب ہے کہ حتی الامکان قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق معاملہ کرے۔اگر کہیں پر کوئی مسئلہ مشتبہ ہو جائے تو ان کے لیے حسب قدرت اجتہاد لازم ہے۔(ص ۱۲۷)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ یہ جان لینا ضروری ہے کہ رعایا کا ایک

والی/حکم راں (یعنی اسلامی نظام حکومت کا ہونا) واجباتِ دین میں سے ہے۔ اس کے بغیر دین کا قیام ممکن ہے نہ دنیا کا۔ چوں کہ انسانوں کو اپنی ضروریات کی تکمیل میں ایک دوسرے سے سابقہ پڑتا ہے اور اجتماعیت کے بغیر یہ ممکن نہیں اور اجتماعیت کے لیے حاکم کا ہونا ضروری ہے (ص ۱۲۹) اسی لیے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب کچھ لوگ سفر کے لیے نکلیں اور وہ تین ہوں تو انھیں چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا لیں۔'' (ابوداؤد) ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''تین لوگوں کے لیے، جو زمین کے کسی حصے میں ہوں، جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لیں۔'' (مسند احمد) جب نبی ﷺ نے اس قلیل تعداد کے لیے، جو کہ وقتی طور پر اکٹھا ہو، نظام امارت کو واجب قرار دیا ہے تو بھلا پوری امت کے لیے اس کا وجوب کیوں نہیں ہوگا؟ نظام امارت کا قائم کرنا اس لیے بھی واجب ہے، کیوں کہ فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قوت واقتدار کے بغیر صحیح طریقے سے ادا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح عدل وانصاف کا قیام، جہاد، مظلوموں کی دادرسی اور حدود کا قیام بھی اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے علمائے سلف حکم رانوں کے لیے دعائے خیر کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اسلامی امارت وحکومت کا قیام دینی حیثیت سے واجب ہے۔ اس سے خود حاکم کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور وہ تقرب، جس میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مقصود ہو، تمام تقربات سے افضل ہے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ ریاست یا مال کے حصول کے معاملے میں اکثر لوگوں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ (ص ۱۳۰) جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مال وریاست کی بے جا حرص آدمی کے دین کے لیے اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے جس قدر بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔'' (ترمذی) اقتدار چاہنے والے چار طرح کے ہوتے ہیں: پہلی قسم ان حکم رانوں کی ہے جو عام لوگوں کو مغلوب ومقہور بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور اللہ کی زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، جیسا کہ فرعون یا اس طرح کے حکم رانوں کی مثال ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو علّو وبرتری کے بغیر فساد کا قصد کرتے ہیں، مثلاً چوری کرنے والے یا دیگر جرائم پیشہ

افراد۔تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو فساد کے بغیر علّو و برتری کے متمنی ہوتے ہیں، جیسے وہ دین دار لوگ جو اپنی دین داری کے ذریعہ سے لوگوں پر تفوق اور برتری چاہتے ہیں۔ چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو نیک نفس ہیں۔ یہ لوگ نہ برائی کے خواہاں ہوتے ہیں نہ فساد کے طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ انسانوں میں اعلیٰ وافضل ہیں اور اللہ تعالی نے انہی سے دنیا میں عزت وحکومت دینے کا وعدہ کیا ہے۔حکومت اور مال کا بنیادی مقصد تقرب الی اللہ اور اقامتِ دین ہو اور مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو اس سے دین و دنیا کی بہتری پیش نظر ہو۔اگر حکومت دین سے محروم یا دین حکومت سے محروم ہو تو لوگوں کے معاملات میں فساد آ جاتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے وقت کے حالات کے پس منظر میں لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے دو فاسد راستے ہیں: ایک راستہ ان لوگوں کا ہے جن کی نسبت دین کی طرف ہے، لیکن وہ قوتِ حرب، جہاد اور مال سے دین کی تکمیل نہیں کرتے۔دوسرا راستہ ان والیانِ حکومت کا ہے جو مال اور جہاد سے کام لیتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد دین کی اقامت نہیں، بلکہ اپنی ذاتی حکومت واقتدار ہوتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔صالحینِ امت حقیقت میں وہ لوگ ہیں جو نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کے طریقے پر عامل ہیں۔امام موصوفؒ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ حتی المقدور اس معاملے میں جد و جہد کریں۔ پس جو کوئی اس نیت سے حاکم بنا کہ وہ اللہ تعالی کی فرماں برداری کرے گا، دین کو قائم کرنے کی کوشش کرے گا، مسلمانوں کا ہم درد و بہی خواہ رہے گا، واجبات کو ادا کرے گا، محرمات سے اجتناب کرے گا تو وہ قیامت کے دن اس سے ان امور میں مؤاخذہ نہ ہوگا، جن کی تکمیل سے وہ عاجز رہا۔(ص ۱۳۱۔۱۳۴) ☆☆☆

نظریۂ وحدت ادیان کا جائزہ

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

______ محترمہ رمیصاء مریم

وحدت ادیان سے اصطلاحی طور پر یہ مراد لیا جاتا ہے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی بزرگ و برتر ذات ہے ، جسے مسلمان اللہ، ہندو ایشور اور انگریز گاڈ(God) کہتے ہیں۔مختلف مذاہب میں عبادتِ الٰہی کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں، اس بنا پر سب ہی انسانوں کو تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیے اور ان کے ماننے والوں سے حسن سلوک اور محبت رکھنی چاہیے۔ یہ بات کہنی درست نہیں ہے کہ آخرت میں نجات کسی ایک مذہب کی پیروی میں منحصر ہے۔

فلسفۂ وحدت ادیان کی جتنی بھی تعریفات کی گئی ہیں ان کا مرکزی خیال یہی ہے کہ تمام مذاہب یکساں اور برحق ہیں اور کسی بھی مذہب کی پیروی سے کائنات کے خالق کی رضا اور خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے ۔ ہر مذہب اس دنیا کے مالک حقیقی کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا انسان کوئی بھی مذہب اختیار کرے، وہ جنت کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا کسی ایک مذہب والوں (خصوصاً اہل اسلام) کا اس بات پر اصرار کہ اب تا قیامت نجات کی سبیل صرف ہمارے مذہب ہی میں ہے، یہ(معاذ اللہ) ایک بے جا سختی ،تشدد یا انتہا پسندی ہے،جس کا خاتمہ از حد ضروری ہے ۔ڈاکٹر احمد بن عبد الرحمن وحدت ادیان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

هو الاعتقاد بصحة جميع المعتقدات الدينية، و صواب جميع العبادات، و انها طرق الى غاية واحدة[۱]

یہ اعتقاد رکھنا کہ تمام مذاہب درست اور عبادتوں کے تمام طریقے ٹھیک

ہیں اور وہ سب ایک ہی منزل تک پہنچانے والے الگ الگ راستے ہیں۔

بسام داوَد عجک کہتے ہیں:

قضية وحدة الأديان التی تری أن الأديان كلّها ذات أصول واحدة، و متفقة فی أهدافها و عقائدها و شرائعها، فلا خلاف فی الحقيقة بين الأديان الا فی المظاهر و الطقوس و العبادات ۲؎

وحدت ادیان کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ تمام ادیان ایک ہی اصول پر قائم ہیں اور وہ اپنے اہداف، عقائد اور شرائع کے معاملے میں یکساں ہیں، ان کی بنیادی حقیقت ایک ہی ہے، بس ان کے ظاہری رسوم و رواج اور عبادت کے طریقے الگ الگ ہیں۔

وائی مسیح کی نظر میں وحدت ادیان کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

There is one religion of the supreme spirit, all othe religions are so many dialects of the same religion of the supreme spirit.3

مولانا وحید الدین خاں نے اس کی یہ تعریف کی ہے:

"وحدت ادیان ایک مستقل نظریہ ہے۔ اس کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ تمام موجود مذاہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں جو فرق ہے، وہ اس کے ظاہری فارم (Form) کے اعتبار سے ہے اور یہ فرق اضافی (Relative) ہے، نہ کہ حقیقی (Real)۔ اس نظریے کے مطابق تمام موجود مذاہب سچے ہیں۔ ان میں جس مذہب کو بھی آدمی اختیار کرے، وہ اس کے لیے نجات (Salvation) کا ذریعہ بن جائے گا۔ نجات کسی ایک مذہب کی اجارہ داری نہیں"۔ ۴؎

مولانا سلطان احمد اصلاحی وحدت ادیان کی تمام تعریفوں کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"منزل ایک ہو تو راستوں کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمام مذاہب میں حق و انصاف، انسانوں کی خدمت، انسان دوستی اور انسانی بھائی چارے کی

تعلیم دی گئی ہے، اس لیے تمام انسانوں کو تمام مذاہب کا یکساں ادب واحترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کا یہ احساس کہ حق وصداقت تنہا انھی کے مذہب کے ساتھ ہے اور آخرت کی نجات کے لیے تنہا اسی مذہب کی پیروی ضروری ہے، مذہب کے سلسلے میں یہ بے جا تشدد اور سختی کا رویہ ہے، جس سے مختلف مذاہب کے درمیان پر امن بقائے باہم کے عظیم مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ دانش مندی اور سمجھ داری کا راستہ یہ ہے کہ بے جا مذہبی تشدد کے راستے کو چھوڑ کر تمام مذاہب کا یکساں احترام اور یکساں طور پر ہر ایک کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کیا جائے۔ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی بزرگ و برتر ذات ہے، جسے ناموں کے اختلاف سے خدا، بھگوان اور God پکارا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب خدا کی بندگی اور اس کو خوش کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ تمام مذاہب کا یکساں احترام اور ہر ایک کی یکساں صداقت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہ ہے وحدت ادیان کے اس نظریے کا خلاصہ جس کا آج (آزاد ہندوستان میں) ہر جگہ چرچا ہے''۔ ۵؎

وحدت ادیان کے اس نظریہ کے متاثرین میں آج ایک کثیر گروہ شامل ہے، جن میں سے اکثریت کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ دانش وروں کا ایک قابل لحاظ طبقہ بھی اس فلسفہ کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کرتا اور اپنے ذرائع سے اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو اس نظریہ کو راہ راست سمجھتے ہیں اور اس کے پرعزم داعی ہیں۔

وحدت ادیان کی اقسام

وحدت ادیان کی کوئی ایک شکل نہیں ہے۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں:

(الف) وحدت صغریٰ

اس سے مراد ہے ایسے تمام ادیان کو ایک دین میں شامل کرنا جو آسمانی ہیں، یعنی سامی ادیان کی وحدت، جن میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام شامل ہیں۔

محمد عبد الرحمن عوض اس کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''وحدت ادیان صغریٰ میں ان ادیان کو جمع کرنا مقصود ہے جن کا اختتام دین ابراہیمی پر ہوتا ہے، یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ اسے وحدت ادیان سماوی کہا جاتا ہے۔ تینوں کے مجموعے کو 'الابراھیمیۃ' کہا جاتا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہے''۔۶؎

ڈاکٹر خالد الجریسی لکھتے ہیں:

''وحدت ادیانِ سماوی سے مراد اسلام، یہودیت اور عیسائیت کو لیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ تمام ادیان کے عبادت خانے بھی یونی ورسٹیوں، ہوائی اڈوں اور پبلک مقامات پر، ایک ہی احاطہ میں ہوں اور ایک ہی غلاف میں تورات، انجیل اور قرآن ملفوف ہوں''۔۷؎

(ب) وحدت کبریٰ

اس سے مراد دنیا میں موجود تمام مذاہب اور نظریات کی وحدت ہے۔ ڈاکٹر احمد بن عبد الرحمن اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اس وحدت میں تمام مذاہب، حتیٰ کہ بت پرست قوموں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ملحدین بھی اس گروہ میں شمار کیے جاتے ہیں، کیوں کہ بت پرست قومیں سابقہ انبیاء کی نشانیاں ہیں اور ملحدین بھی 'انسانیت' (Humanism) پر ایمان رکھتے ہیں۔۸؎

مترادف اصطلاحات

نظریۂ وحدت ادیان کے لیے کئی اور اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً'' **توحید الأدیان، توحید الأدیان الثلاثۃ، الابراھیمیۃ، الملّۃ الابراھیمیۃ، وحدۃ الدین الالٰھی، المؤمنون، المؤمنون المتحدون، الناس المتحدون، الدیانۃ العالمیۃ، التعایش بین الأدیان، الملّیون، العالمیۃ و توحید الأدیان** ۹؎

فلسفۂ وحدت ادیان کی تاریخ

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے اور نہ اس صدی کی پیداوار ہے، بلکہ ایک نظریہ اور آئیڈیالوجی کے طور پر اس کی جڑیں بہت قدیم ہیں، جو حالات اور واقعات کے مطابق اپنا رنگ ڈھنگ تبدیل کر کے نت نئے طریقوں سے سامنے آتی ہیں۔ شیخ بکر بن عبداللہ بن ابوزید لکھتے ہیں:

”یہ یہود و نصاریٰ کا نظریہ ہے۔ یہ محض اپنی علامات اور نشانیوں کی بنا پر نیا ہے، ہر جگہ مسلمانوں میں مکمل طور پر اس کی فکر سرایت کر چکی ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے کوشش ہے کہ مسلمانوں سے اسلام کی دولت چھین لی جائے، ورنہ فی الحقیقت یہ نظریہ قدیم ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہیں“۔ ۱۰؎

اگر اس نظریہ کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اس کے منظر عام پر آنے، عوامی سطح پر پھیلاؤ اور اس کے اثرات کے اعتبار سے اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شیخ بکر بن عبداللہ اور جناب مقصود الحسن فیضی نے اس کے وجود و ارتقاء کے چار مراحل بیان کیے ہیں:

۔ پہلا مرحلہ: عہد نبوی ﷺ

۔ دوسرا مرحلہ: مابعد زمانہ خیر القرون

۔ تیسرا مرحلہ: اوائل چودھویں صدی

۔ چوتھا مرحلہ: عصر حاضر ۱۱؎

اس زمانی ترتیب اور اس کے تاریخی ارتقاء کی روشنی میں مختلف گروہوں اور اس فکر کے مؤیدین کے وجود وارتقاء اور پھیلاؤ کا ایک اجمالی ساخاکہ ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ

اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے مشرکین مکہ نے اسلام قبول کرنے

والوں کے ساتھ ظلم وستم اور تشدد کا راستہ اختیار کیا، لیکن جب اس میں کام یاب نہ ہو سکے تو سودے بازی پر اتر آئے اور 'کچھ لو، کچھ دو' کے اصول کو اپنا کر اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

سورۃ الکافرون کا سبب نزول تمام مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے نبی ﷺ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود (اللہ وحدہ لا شریک لہ) کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ ہم حق پر ہوئے تو آپ کو بھی ایک حصہ حق کا مل جائے گا اور ہمیں آپ کے دین حق میں سے ایک حصہ مل جائے گا، وغیرہ۔ اس پر سورۃ الکافرون نازل ہوئی۔ ۱۲؎

علامہ جصاص رازی اس سورت کی آیت 'وَلَا اَنتُم عَابِدُونَ مَا اَعبُد' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

فانها قد دلّت على أن الكفر كله ملة واحدة، لأنّ من لم يسلم منهم مع اختلاف مذا هبهم مرادون بالآية، ثم جعل دينهم ديناً واحداً و دين الاسلام ديناً واحداً، فدلّ على أن الكفر مع اختلاف مذاهبه ملة واحدة۔ ۱۳؎

یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کفر کے حاملین ایک ملت ہیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ، جو اسلام نہیں لائے تھے، یہاں وہ سب مراد ہیں۔ ان کے دین کو ایک دین کہا گیا ہے اور اسلام کو الگ دین قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر کے ماننے والے الگ الگ مذاہب کے باوجود ایک ملت ہیں۔

یہود اور نصاریٰ بھی کہا کرتے تھے کہ چاہے یہودیت قبول کرلو، چاہے نصرانیت اختیار کرلو، ہدایت مل جائے گی۔ اس کا رد کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالُوا كُونُوا هُوداً أَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرٰاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (البقرۃ: ۱۳۵)

یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ تم کہو: بلکہ صحیح

راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے۔

وحدۃ الوجود اور غلو پر مبنی صوفیہ کے نظریات

تصوف کے حاملین میں جب غلط افکار نے جڑ پکڑی تو اس کی بنا پر وحدتِ ادیان کے فتنے نے سر ابھارا اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ تمام مذاہب اور عبادت کے تمام طریقوں سے اللہ کی خوش نودی حاصل کی جا سکتی ہے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے نیکلسن کے حوالے سے لکھا ہے:

''عیسائیت، جدید افلاطونی افکار، بدھ ازم سمیت کئی افکار اور فلسفے ہیں جن کا اسلامی تصوف پر گہرا اثر ہے۔ جس زمانے میں تصوف پروان چڑھا، اس زمانے میں ان تمام مذاہب اور فلسفوں کا غلغلہ تھا، لہٰذا تصوف پر ان کی گہری چھاپ کا لگنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت سی دلیلیں شاہد ہیں۔ خلاصۂ کلام کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیسری صدی میں تصوف ایک مسلک کے طور پر سامنے آیا، جو بہت سے افکار اور خیالات کا نتیجہ تھا۔ اس میں اسلامی عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کا تصورِ رہبانیت اور ہندوؤں اور یونانیوں کا فلسفہ بھی شامل تھا''۔ ۱۴؎

علم تصوف میں شامل ہونے والے تین نظریات: وحدۃ الوجود، حلول اور اتحاد، آخر میں وحدت ادیان ہی کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں۔ مثلاً ابن عربی کے ایک شعر سے اس کی ترجمانی کچھ اس طرح ہوتی ہے:

لقدصار قلبی قابلا کل صورۃ فمرعی لغزلان ودیر لرهبان
وبيت لأوثان وكعبة طائفٍ وألواح توراة ومصحف قرآن
أدين بدين الحب أنى توجهت ركائبه فالحب ديني وايماني ۱۵؎

میرا دل ہر صورت قبول کر لیتا ہے، ہرن کی چراگاہ ہو یا کسی راہب کی کٹیا، بت کدہ ہو یا طائف کا کعبہ، تورات کی تختیاں ہوں یا مصحف قرآن، میں دینِ محبت کا ماننے والا ہوں، اس کے سوار جہاں چلے

جائیں، محبت ہی میرا دین وایمان ہے۔

اسی عقیدہ کے حامل ایک اور صوفی شاعر کے خیالات شعر کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھلتے ہیں:

مسلم أنا و لكنی نصرانی و برهمی و زرداشتی

توکلت علیک ایها الحق الأعلیٰ لیس لی سوی معبدواحد

مسجد أو كنيسة أو بيت أصنام و وجهک الکریم فیه غایة نعمتی[۱۶]

میں مسلمان ہوں، لیکن نصرانی، برہمن، زردشت بھی ہوں، اے حق تعالیٰ! تجھ پر میں اعتماد رکھتا ہوں، میرے لیے ایک ہی عبادت گاہ ہے: مسجد ہو یا کنیسہ یا بت کدہ۔ تیرا معزز چہرہ میری لذتوں کی انتہا ہے۔

شیخ بکر بن عبداللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"نظریۂ وحدت ادیان کو کچھ ایسے داعی ومبلغ میسر آئے جو وحدۃ الوجود، اتحاد اور حلول کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ ملحد صوفیہ کا گروہ تھا، جس کا تعلق مصر، شام، فارس اور عجم کے علاقوں سے تھا۔ غالی قسم کے روافض ان کے وارث بنے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہود و نصاریٰ بننا بھی جائز ہے، بلکہ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو یہودی و عیسائی ہونے کو مسلمان بننے پر فوقیت دیتے تھے"۔[۱۷]

ان نظریات کے عروج کے وقت شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے دلائل سے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی کئی کتب میں ان کا زبردست رد کیا۔[۱۸]

بھکتی تحریک

جب مسلمان تاجر ہندوستان میں آئے اور انھوں نے اخلاق ومساوات کا بہترین نمونہ پیش کیا تو ہندوؤں کے ذات پات، چھوت چھات پر قائم معاشرہ کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ اس وقت ہندو مفکرین اور مذہبی مصلحین نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے اسلام کی روح کو مسخ کرنے

اور مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا فرقہ تشکیل دیا، جو 'بھگتی تحریک' کہلاتا ہے۔ یہ تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کے اتحاد کی ایک مقبول عام کوشش کے طور پر مشہور ہے۔ اس کا سب سے مشہور داعی 'کبیر' ہے، جو ہندو مسلم عقائد کی وحدت کا ایک بڑا علم بردار تھا۔ اس نے دونوں مذاہب کے مشترک عناصر اور باہمی مشابہتوں کا انتخاب کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے فلسفیانہ تصورات وشعائر مذہب کے مابین بہت سی مماثلتیں نکال کر ایک درمیانی راہ کی تعلیم دی۔ وہ کہتا ہے:

> ''ہندو مندر میں جاتے ہیں اور مسلمان مسجد میں، لیکن کبیر اس جگہ جاتا ہے جہاں ہندو اور مسلم دونوں جاتے ہیں۔ دونوں ادیان دو شاخیں ہیں اور ان کے بیچ سے ایک شاخ پھوٹتی ہے جو دونوں سے آگے نکل گئی ہے۔۔۔ اگر تم کہو کہ میں ہندو ہوں تو یہ صحیح نہیں اور اگر کہو کہ میں مسلمان ہوں تو یہ بھی صحیح نہیں۔ میں عناصر خمسہ کا وہ مرکب جسم ہوں جہاں وہ غیبی کارفرما ہے۔ بالیقین مکہ معظّمہ کاشی ہو گیا ہے اور رام رحیم ہو گیا ہے۔''۱۹؎

کبیر چوں کہ ہندو اور مسلم کو ایک ساتھ خطاب کرتا ہے، اس لیے خدا کے لیے رام، ہری گوبند، برہما، سمرتھا، سائیں، اللہ، رحمان، رحیم تمام الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کا مشہور قول ہے کہ: ''اہل شعور کا مذہب ایک ہی ہے، خواہ وہ پنڈت ہوں یا شیوخ''۔۲۰؎

ڈاکٹر تاراچند نے کبیر کے افکار پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

> ''کبیر نے اسلام اور ہندومت کے امتزاج کی اولین کوشش کی۔ جنوبی ہند کے ہندو گروہوں نے مسلم عناصر کو جذب کر لیا تھا، لیکن کبیر وہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مرکزی مذہب، ایک بیچ کی راہ کا بے باکانہ آگے آ کر اعلان کیا۔ کبیر کے بے شمار ہندو مسلم ماننے والے تھے، لیکن کبیر کے پیرو ان مذہب کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ کبیر کا وہ اثر جو پنجاب،

گجرات اور بنگال تک پھیل گیا اور دور مغلیہ میں بڑھتا گیا: یہاں تک کہ ایک 'عاقل بادشاہ' نے اس کے مذہب کی قدرو قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ اس کو سرکاری مذہب بنالیا جائے۔۲۱؎

اکبر کا دینِ الٰہی

وہ 'عاقل' بادشاہ، جس کی طرف ڈاکٹر تارا چند نے اشارہ کیا تھا کہ اس نے کبیر کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کے مذہب کو سرکاری طور پر رائج کرنے کی کوشش کی، وہ کوئی اور نہیں، مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر ہے۔ اس کے دور میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی انفرادیت کو مٹا کر مذاہب کی مشترک اور مخلوط بنیادوں پر وطنی قومیت اور متحدہ کلچر کو فروغ دیا گیا اور وحدتِ ادیان کے نعرے سے متاثر اکبر نے اتحادِ مذاہب کی نمایاں مثال پیش کی۔

عزیز احمد اس کی فکر کے متعلق لکھتے ہیں:

''۱۵۷۹ء اور ۱۵۸۲ء کے درمیان اکبر اپنے روحانی تجربات کے نہایت نازک دور سے گزرا۔ ۱۵۸۱ء میں اس نے اپنے دین الٰہی کا اعلان کیا، جس میں عقل کو مذہب کے سمجھنے کے لیے بنیاد قرار دینے پر زور دیا گیا''۔۲۲؎

دین الٰہی کے بنیادی نکات درج ذیل تھے:

۔دس صفات کی تلقین: وسیع القلبی، برے افعال پر صبر اور نرمی کے ساتھ غصہ کو دفع کرنا، زہد و اجتناب، شدید مادی مشاغل سے علٰیحدگی، تقوی، دین داری، ہوش مندی، شرافت، مہر و محبت، خدا سے لگاؤ، اور خدا طلبی کی آرزو میں روح کی صفائی۔

۔سورج، نور اور نار کے ساتھ غیر معمولی شغف۔(آفتاب پرستی یعنی پارسی مذہب کی شمولیت)

۔گوشت خوری سے حتی الوسع اجتناب۔

۔ہندو تہوار دیوالی کے موقع پر گائے کی پرستش۔

۔گنگا جل کو متبرک قرار دینا۔

۔ ہندو عورتوں سے شادی اور صلح کل کے نام پر بت پرستوں کو اہل کتاب قرار دینا۔ ۲۳؎

بابائیت یا بہائیت

وحدت ادیان کا پرچار کرنے والے گروہوں اور تحریکوں میں سے بابیت اور بہائیت بھی ہیں، جنھوں نے شریعتِ اسلامیہ کو منسوخ قرار دیا اور ایک نئی شریعت بنا کر پیش کی گئی۔ اس تحریک کا بانی تو علی محمد باب تھا، جس نے ابتدا میں 'باب' (امام مہدی اور لوگوں کے درمیان واسطہ) ہونے کا دعویٰ کیا، پھر آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اس نے ایک نیا 'قرآن' بھی لکھا اور اسلامی شریعت کی منسوخی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اس کا سب سے خاص مرید مرزا حسین علی المعروف بہاؤ اللہ نے نبوت کا اعلان کیا۔ اس طرح بابائیت، بہائیت میں تبدیل ہو گئی۔

بہاؤ اللہ نے جو نیا دین پیش کیا اس کی مندرجہ ذیل پانچ تعلیمات سب سے اہم ہیں: (۱) وحدتِ ادیان (۲) وحدتِ اوطان (۳) وحدتِ لسان (۴) امن عالم بذریعہ ترکِ جہاد (۵) مساواتِ مرد و زن ۲۴؎

اس کی پہلی تعلیم وحدتِ ادیان سے متعلق ہے، جس میں اس کا یہی عقیدہ ہے کہ باقی رہنے والی چیز اتحاد و اتفاق ہے۔ اس کا بیٹا عبدالبہا، جو کہ اسی عقیدہ کا حامل ہے، لکھتا ہے:

> A fundamental teaching of Baha'u'llah is the oneness of the world of humanity. Addressing mankind he says: "Ye are all leaves of one tree and the fruits of one branch" By this it is meant that the world of humanity is like a tree, the nations or peoples are the different limbs or branches of that tree and the individual human

creatures are as the fruits and blossoms thereof. His Holiness Baha'ullah has announced that the foundation of all the religions of God is one; that oneness is truth and truth is oneness which does not admit of plurality".25

یعنی بہائی عقائد کے مطابق اس دنیا میں انسانیت ایک ہے اور تمام ادیان، مذاہب اور افکار کی بنیاد اور جڑ بھی ایک ہے، جو وحدتِ ادیان پر قائم ہے۔

فری میسن تحریک

فری میسنز ی یہودیوں کی سب سے بڑی اور خفیہ عالمی تنظیم ہے، اس کے ارکان کا تعلق مختلف مذاہب اور اقوام سے ہوتا ہے، جن کو فری میسن کہا جاتا ہے۔ ۲۶ یہ تنظیم اپنے اثرات اور اسرار کے باعث بہت سے افراد کے لیے ایک معمہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کا ایک مقصد تمام ادیان کو ختم کر کے اس کی جگہ انسانی اخلاقیات کا ایک منشور پیش کرنا ہے، جس کے لیے وقتاً فوقتاً کی جانے والی کوششیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ شیخ بکر بن عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''ایک عرصہ تک لوگوں کے دلوں میں یہ تباہ کن سازش پوشیدہ رہی۔ وہ اسلام کا برائے نام دعوی کرتے اور دلوں میں کفر و الحاد چھپاتے رہے۔ بالآخر اسے ماسونیت (فری میسن) نے اختیار کرلیا۔ یہ یہودی تنظیم ہے، جس کا مقصد الحاد اور اباحیت کی اشاعت تھا۔ اس نے تینوں مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کی وحدت کی دعوت دی اور اللہ پر ایمان کے معاملے میں مذہبی تعصب ترک کرنے کا نعرہ دیا۔ اس کی نظر میں سب مؤمن ہیں۔ ۲۷

اس تنظیم کا ہدف یہ ہے کہ تمام مذاہب کو ختم کر کے یا ان کا چربہ بنا کر ایک 'مذہبِ انسانیت' تشکیل دیا جائے۔ جواد رفعت اتلخان نے لکھا ہے:

''عالمی ماسونیت کا اس دعوت کو عام کرنے میں زبردست کردار رہا کہ تمام ادیان کو ختم کر کے ایک دین کو باقی رکھا جائے، جس کا انھوں نے 'بین الاقوامی انسانی وحدت' نام دیا''۔ ۲۸؎

نظریۂ وحدتِ ادیان کے حاملین کی سرگرمیاں

۔ پوپ نے اپنے آپ کو پوری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ وہ تمام ادیان کا روحانی و مذہبی قائد، عالم اسلام اور عام انسانیت کا رہ نما اور بین الاقوامی پیغام کا حامل ہے۔

۔ پوپ نے ۲۷/اکتوبر ۱۹۸۶ء کے دن کو تمام ادیان کی عید اور عام بھائی چارے کا دن قرار دیا، پھر ایک ترانہ تیار کیا گیا، جسے تمام لوگ پڑھنے لگے۔

۔اس نظریہ کو پھیلانے کے لیے تمام عالم اسلام میں اجتماعات، اجلاس، مکالمے اور مذاکرے کیے گئے اور جماعتیں تشکیل دی گئیں، جو ایک دین کی دعوت دیں اور اس کے لیے محافل ومجالس کا انعقاد کریں۔

۔۱۵،۱۶ فروری ۱۹۸۷ء کو ایک اجلاس میں اس تنظیم کا 'المؤتمر الابراہیمی' کے نام سے متعارف کرایا گیا۔ یہ اجلاس قرطبہ میں ہوا۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں یہودی، قادیانی، اسماعیلی، باطنی فرقے اور مسلمان بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں 'مؤتمر الحوار الدولی للوحدۃ الابراہیمیۃ' کے نام سے مذاکرے اور مکالمے ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادارہ بنایا گیا، جس کا نام' معہد قرطبہ لوحدۃ الادیان فی اوربا' رکھا گیا۔

۔مارچ ۱۹۸۷ء میں ایک جماعت بنائی گئی، جس کا نام 'المؤمنون المتحدون' رکھا گیا۔

۔ایک اور جماعت بنائی گئی جس کا نام' نادی الشباب المتدین' تجویز کیا گیا۔

۔اسی طرح ایک اور جماعت بنائی گئی، جس کا نام 'الناس المتحدون' رکھا گیا۔

۔ایسی تنظیمیں اور جمعیتیں بنائی گئیں جن کا ہدف یہ تھا کہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جو امتیازی اوصاف ہیں، انہیں ختم کر دیا جائے۔

اس کے لیے ایک نام 'موحدۃ الادیان' روشناس کرایا گیا۔۲۹؎

وحدتِ ادیان کے محرکات ونتائج

اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھنی مشکل نہیں کہ دشمنانِ اسلام مختلف ہتھکنڈوں سے ہمیشہ اسلام کی بیخ کنی میں مصروف عمل رہے ہیں، چاہے وہ ظلم کی راہ سے ہو یا خوش نما وعدوں کے ذریعے ۔ یہ لوگ اپنی ناپاک سازشوں کو کام یاب کرنے میں لگے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طریقے سے مسلمانوں کو کم زور کر دیں اور انہیں مرتد و کافر بنا دیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاء (النسائ:۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرنے لگو جیسے وہ خود کافر ہیں، تا کہ تم اور وہ یکساں ہوجاؤ۔

اسی بنا پر یہ لوگ کبھی دشمنی اور کبھی دوستی کے لبادے میں مختلف طریقوں سے مدد لیتے ہیں اور وحدت ادیان کے نظریے کی پشت پر یہی فکر کارفرما ہے۔

فلسفۂ وحدت ادیان کے پیچھے ایک اور محرک یہ خیال ہے کہ انسان اگر 'نیک نیتی' کے ساتھ زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرے تو وہ جس نتیجے پر بھی پہنچ جائے وہ درست ہے۔ اس خیال کے حاملین کو 'اضافیت کے قایلین' (Relativists) کہا جا سکتا ہے ۔گویا ان کے نزدیک 'مطلق حق' کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، بلکہ حق یا سچائی کے مختلف روپ یا درجات ہیں۔ آدمی جس درجے تک بھی پہنچ جائے وہ اس کے لیے کافی ہے۔۳۰؎

فلسفۂ وحدت ادیان کے آغاز اور اس کی تعلیم کے فروغ کے پیچھے ایک محرک اسلام کی حقانیت کے خلاف ردعمل بھی ہے،خصوصاً ہند میں وحدت ادیان کی فکر کے فروغ کی بنیادی وجہ خود حفاظتی اور ہندو روحانیت کے قیام و دوام کی خواہش ہے۔۳۱؎

نظریۂ وحدت ادیان کو قبول کرنے اور اس کی تائید کرنے سے جو نتائج لازم آتے ہیں انھیں ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے :

۱۔عقیدۂ ولاء و براء کی نفی

اس کا اولین نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ شریعت اسلامی کے حکم ’الموالاۃ فی اللہ والمعاداۃ فی اللہ‘ سے روگردانی ہوتی ہے۔ شیخ مقصود الحسن فیضی لکھتے ہیں:

”وحدت ادیان کا نظریہ عقیدۂ موالات ومعادات کے یکسر منافی ہے۔ حالاں کہ لا الہ الا اللہ کے شرائط ولوازم میں سے عقیدۂ موالات و معادات بھی ہے۔ وحدت ادیان کا نظریہ قبول کر لینے کا صاف مفہوم یہ ہے کہ ہماری موالات اللہ و رسول اور اہل ایمان کے ساتھ ساتھ کفار و مشرکین اور منافقین سے بھی ہے ۳۲۔“

۲۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نفی

اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور باقی ادیان کو منسوخ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو حکم دیا گیا ہے، ظاہر ہے، وحدت ادیان کو مان لینے سے اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ وحدت ادیان کی فکر کو تسلیم کر لینے سے خود بہ خود تمام مذاہب و ادیان کی حقانیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

۳۔روحِ جہاد کا خاتمہ

وحدت ادیان کا نظریہ قبول کر لینے کا ایک لازمی اثر یہ بھی ہے کہ اسلام میں جہاد نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے، کیوں کہ جہاد کی اصل فرضیت اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مبارک دین کی تبلیغ میں اگر کوئی جماعت اور قوم رکاوٹ بنے تو اس کے خلاف جہاد فرض ہے۔ اب جب سارے مذاہب ایک دوسرے کی حقانیت کو قبول کر لیں تو کسی کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ چنانچہ جہاد کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ حامد کمال الدین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''جہاد ادیان کا فرق نمایاں کرنے سے جنم لیتا ہے ، بلکہ دعوت بھی ادیان کا فرق نمایاں کرنے سے ہی جنم لیتی ہے۔ البتہ ادیان کے مابین وحدت یا اشتراک کی تلاش جہاد ہی نہیں ،دعوت کا بھی قتل ہے۔[۴۰]

جہاد کے احکام اوراس کے حدود وشرائط سے یہاں بحث نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔

۴۔علاقوں سے دست برداری کا اعلان

جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے عقیدے اور جہاد جیسے فریضے سے ہی رجوع کرلیا جائے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے ایسے علاقے اور خطے ،جن پر غیر مسلم قابض ہیں، ان سے دست برداری کا اعلان کر دیا جائے۔ شیخ مقصود الحسن فیضی لکھتے ہیں:

''اس نظریہ کوقبول کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان ،خصوصاً عرب یاوہ مسلمان جوکسی بھی جگہ غیر مسلموں سے نبرد آزما ہیں اور ظالموں نے ان کی زمین، جائیداد ہڑپ کررکھی ہے، اب اپنا تنازعہ ختم کردیں، فلسطین پر ظالم یہودیوں کا قبضہ تسلیم کرلیں، فلسطین اور بیت المقدس کا مطالبہ ترک کر دیں، ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنا تشخص چھوڑ کر ہندوستانی تہذیب میں ضم ہوجائیں''۔[۳۴]

نظریۂ وحدتِ ادیان۔ اسلامی شریعت کی روشنی میں

شریعت اسلامیہ نظریۂ وحدت ادیان کو کلیۃً رد کرتی ہے۔ مختلف علماء کرام نے صراحت سے اس کو رد کیا ہے۔ شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید کہتے ہیں:

''یہ ایک باطل نظریہ ہے جواسلام کوتباہ وبرباد کردیتا ہے، حق اور باطل

یعنی اسلام اور دیگر مذاہب کو جمع کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر ایک شدید حملہ ہے۔ ۳۵؎

مزید لکھتے ہیں:

''معبود واحد ہے، اگرچہ اس تک پہنچنے والے راستے مختلف ہیں، یہ ہمیشہ سے وحدت ادیان کے داعیوں کا نعرہ رہا ہے۔ یہ عین کفر اور گم راہی ہے۔ دین اسلام تو تمام ادیان کو منسوخ کرنے والا ہے''۔ ۳۶؎

سعودی عرب کی مستقل فتوی کمیٹی (اللجنۃ الدایمۃ للبحوث العلمیۃ) نے ایک موقع پر 'وحدتِ ادیان' کے بارے میں یہ رائے دی تھی:

''وحدت ادیان کی طرف اگر کوئی مسلمان دعوت دے تو یہ صریح ارتداد ہے، اس لیے کہ یہ بنیادی عقیدہ سے متصادم ہے۔ اس سے کفر پر راضی ہونا لازم آتا ہے اور قرآن کی صداقت پامال ہوتی ہے۔ اسلام نے گزشتہ تمام ادیان و مذاہب کو منسوخ کیا ہے۔ وحدت ادیان سے اس کا انکار لازم آتا ہے۔ اس بنا پر یہ نظریہ قابلِ رد اور قطعی طور پر حرام ہے۔ قرآن و حدیث اور اجماع، سب سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ ۳۷؎

اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسلمان کسی بھی دوسرے ایسے مذہب سے اتحاد نہیں کر سکتے، جس سے ان کے بنیادی عقائد پر زد پڑتی ہو اور اسلام میں کسی اور دین کی آمیزش کا شائبہ ہو۔

دیگر مذاہب اور اسلام کے درمیان ہم آہنگی کی حقیقت

سب سے پہلے تو اس حقیقت کا تعین کرنا ضروری ہے کہ اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں جو انسان کی صرف نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ کچھ عبادات، اذکار اور رسوم ہوں، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اللہ اور اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایت الٰہی کے نور سے منور

کرتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو، سیاسی، ملکی ہو بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اسی کا قانون جاری و ساری ہو اور زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات ہی نافذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْ ☐ كُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً (المائدۃ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

مولانا مودودیؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے''۔ ۳۸؎

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنه (آل عمران: ۱۹)

''اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

دینِ واحد۔ اسلام

یہاں پر یہ بات سمجھنی بھی بہت ضروری ہے کہ دراصل اللہ کے نزدیک قابلِ اتباع دین ایک ہے اور وہ اسلام ہے، جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور اسی سلسلے کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔

مسلمانوں کی کثیر تعداد یہی سمجھتی ہے کہ اسلام کی ابتدا شریعت محمدیہ سے ہوئی۔ اگرچہ یہ بات ایک خاص جہت سے درست ہے،لیکن 'اسلام' کو اس معنی میں محصور کر لینے سے ذہن دین اسلام کے اطلاقی مفہوم سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ دین ایک ہی ہے، جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ چنانچہ اسلام کے اس اصلی مفہوم کو سمجھ کر ہم وحدت ادیان کے قائل لوگوں کی بات کو رد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، یعنی اس سے وحدت ادیان کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ دین تو بس ایک ہی ہے، چنانچہ جب دوسرا دین کوئی ہے ہی نہیں سوائے اسلام کے، تو ادیان کی وحدت کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ (آل عمران: ۱۹)

بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اسلام اللہ کا وہ دین ہے جسے اس نے مشروع کیا ہے اور اس کے ساتھ اپنے انبیاء کو مبعوث کیا ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں نے اس کی توضیح وتشریح کی ہے۔ اللہ اس کے علاوہ کسی دین کو قبول نہیں کرے گا اور صرف اسی کے مطابق عمل کرنے پر بدلہ دیا جائے گا۔

وہ امام ضحاکؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ **اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰهِ الإِسلَامُ** سے کیا مراد ہے؟ اس کا انہوں نے جواب دیا: ''اللہ نے کسی رسول کو اسلام کے علاوہ کوئی دین دے کر نہیں بھیجا ہے''۔ ۳۹؎

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء ورسل اسلام ہی کی دعوت لے کر آئے تھے اور جن لوگوں نے اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا وہ مسلم نہیں اور اسلام کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُواْ كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (البقرۃ: ۱۳۵)

یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو جاؤ تو

ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو کہ نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اختیار کرلو اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھا۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے: ایک یہ کہ یہودیت وعیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہودیت اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خودبخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا معیار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالم گیر صراط مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔[۴۰]

اور عالم گیر ہدایت محض دینِ اسلام ہے، اور کوئی نہیں۔

دیگر مذاہب کے ساتھ اسلام کا تعلق

اسلام نے دیگر مذاہب کے بارے میں یہ ہدایات دی ہیں، جن کی پابندی کی جانی چاہیے:

احترام مذہب

اسلام کے برحق اور واحد قابل اتباع دین ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے ساتھ احترام کا معاملہ رکھیں اور ان کے وہ عقائد جو مسلمانوں کے لیے نا قابلِ قبول ہیں ان کو محض بحث و مباحثہ کی غرض سے برا بھلا نہ کہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلاتَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام:۱۰۸)

اے ایمان والو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مکالمہ بین المذاہب

چوں کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اسلام ہی دین برحق ہے، اس لیے ان پر یہ لازم کیا گیا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ چوں کہ وہ آخری امت ہیں، اس لیے تمام انسانوں تک پیغامِ الٰہی پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت دینے والوں کے لیے مکالمے کے اسالیب کی نشان دہی کر دی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادْعُ إِلِى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل:۱۲۵)

دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کرو لوگوں سے ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔

اس آیت میں دعوت وتبلیغ کے تین بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں: حکمت،

موعظۃ حسنۃ اور مجادلہ احسن۔ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین اقسام کی بنا پر ہیں:

دعوت بالحکمۃ: اہلِ علم وفہم کے لیے۔

دعوت بالموعظۃ: عوام کے لیے۔

مجادلۂ احسن: ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں شکوک وشبہات ہوں، جو ہٹ دھرمی کی بنا پر حق کے منکر ہوں۔ [۴۱]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَیۡـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ (آل عمران: ۶۴)

کہو، اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو، ہم تو مسلم ہیں۔

بدی کا جواب نیکی سے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ادۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَكَ وَبَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ (حٰمٓ السجدہ: ۳۴)

اور (اے نبی!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

اس آیت کے ذریعے مسلمانوں کو ایک اہم تعلیم یہ دی گئی ہے کہ وہ دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور اگر وہ ان کے ساتھ برائی سے پیش آئیں تو ان کا جواب اچھائی سے دیں۔

ان تعلیمات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ مکالمہ بین المذاہب سے مذاہب کی تعلیمات کا ملغوبہ تیار کرکے اتحاد قائم کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا، بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہو سکتا ہے کہ مذاہب کے پیرو کار مشترکہ مقاصد کے حصول کی خاطر باہم تعاون و رواداری کا مظاہرہ کریں۔ لیکن اگر اس رواداری کا مطلب مذاہب کی تعلیمات کا اتحاد کرکے کوئی نیا عالمی مذہب (Global Religion) بنانا ہے تو ایسا کرنا ہرگز روا نہیں۔ کیوں کہ اگر اسلام 'لَا اِکرَاہَ فِی الدِّینِ' کے نقطۂ نظر کا حامل ہے تو اس کے پاس 'لَکُم دِینُکُم وَلِی دِین' کی تعلیم بھی موجود ہے۔ اگر مقصد یہ ہو کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کرلیں گے تو یہ رواداری نہیں، بلکہ فتنۂ رواداری ہے۔ ۴۲؎

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر احمد بن عبدالرحمن، دعوۃ التقریب بین الادیان، دار ابن الجوزی، الریاض، ۱۴۲۱ھ، ۱/ ۳۳۹

۲۔ بسام داؤد عجک، الحوار الاسلامی المسیحی، دار طیبۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء، ص ۴۱۷

3. Y. Masih, Introduction to Religious Philosophy, P. 359, Motilal Banarsidas Pub., 31 May, 1991.

۴۔ وحید الدین خان، ماہ نامہ الرسالہ، مضمون: 'وحدت ادیان کا نظریہ'، اکتوبر ۲۰۱۳ئ، نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نیو دہلی، ص ۱۰

۵۔ سلطان احمد اصلاحی، وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام، دار التذکیر، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰

۶۔ محمد عبدالرحمن عوض، الاسلام والادیان، ضوابط التقریب بین البشر، دار البشر، القاھرۃ، سن ندارد، ص ۷

۷۔ ڈاکٹر خالد بن عبد الرحمن الجریسی، ، فتاوی علماء البلد الحرام، اللجنۃ الدایمۃ لبحوث العلماء، مؤسسۃ الجریسی للتوزیع والاعلان، الریاض، ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ئ، ص ۱۱۷

۸۔ دعوۃ التقریب بین الادیان، ۱/ ۳۲۲

۹۔ ابوزید، بکر بن عبداللہ، الابطال لنظریۃ الخلط بین دین الاسلام وغیرہ من الادیان، دار العاصمۃ

للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۱۷ھ، ص ۲۴

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص۱۶

۱۱۔ حوالۂ سابق، ص۱۶، مقصود الحسن فیضی، وفاداری یا بیزاری، نور اسلام اکیڈمی، لاہور س۔ د

۱۲۔ ابن جریر الطبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ئ، ۷/ ۵۶۷، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ئ، ۸/ ۹۷۴، قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القراان، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ئ، ۲۲/ ۵۳۳

۱۳۔ جصاص، ابوبکر، احمد بن علی، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۲ھ/ ۱۱۹۴ئ، ۵/ ۳۷۶

۱۴۔ احسان الٰہی ظہیر، تصوف۔ تاریخ وحقائق، ادارہ ترجمان السنۃ، لاہور، اگست ۲۰۱۰ئ، ص ۱۶۷

۱۵۔ بحوالہ طارق عبدالحلیم، د۔، محمد العبدہ، صوفیت کی ابتداء و ارتقائ، ترجمہ: الصوفیۃ: نشأتھا و تطورھا، مترجم: مدثر احمد لودھی، مرکز دار الارقم، ۲۰۰۷ئ، ص ۶۷

۱۶۔ حوالۂ سابق

۱۷۔ الابطال لنظریۃ الخلط بین دین الاسلام وغیرہ من الادیان، ص ۱۸

۱۸۔ تفصیل سے ان کارد پڑھنے کے لیے دیکھیں: ابن تیمیہ، احمد، الحرانی، مجموعۃ الفتاوی، دار الوفاء للنشر والتوزیع، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ئ، ۵/ ۴۷۔۹۷، کتاب الرد علی المنطقیین، دار ترجمان السنۃ، پاکستان۔ ۱۹۷۶ء

۱۹۔ تارا چند، ڈاکٹر، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مترجم: محمد مسعود احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۶۴ئ، ص ۲۴۵

۲۰۔ حوالۂ سابق، ص ۲۵۱، ۲۷۰

۲۱۔ حوالۂ سابق، ص ۲۷۰

۲۲۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی کلچر، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۰

۲۳۔ تفصیل سے پڑھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے: برصغیر میں اسلامی کلچر، ص: ۲۶۰۔ شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۵ئ، ص ۱۲۳۔ ۱۲۵

۲۴۔ نذیر احمد بھٹی، عبدالرؤف ظفر، بہائیت اور اس کے معتقدات، قرآنک عربک فورم، بہاول پور،

مارچ۱۹۹۹ئ،ص ۲۰، ۵۴

25. Abdul Baha, Baha'i World Faith, P. 246,247,US Baha'i Publishing Trust, 1976

۲۶۔ تفصیل ملاحظہ کیجیے:

Mark Stavish, Freemasonry: Rituals, Symbols & History of the Secret Society, Llewellyn Publications Woodbury Minnesot, USA, 2007

۲۷۔ الابطال،ص ۲۰

۲۸۔ جوادرفعت اتلخان، اسرارالماسونیۃ، دارالتراث العربی، لیبیا،س۔ن،ص ۲۳

۲۹۔ محمدالغزالی، قذائف الحق، دارالقلم، دمشق، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ئ، الابطال،ص۹، الاسلام والادیان،ص ۳۶

۳۰۔ وحدت ادیان کا نظریہ(الرسالہ)،ص ۱۰

۳۱۔ برصغیر میں اسلامی کلچر،ص ۲۱۴

۳۲۔ وفاداری و بیزاری،ص ۲۲، اسلام میں عقیدہ ولاء و براء کی اہمیت اور حکم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: القحطانی، محمد بن سعید، الولاء والبراء فی الاسلام، دارطیبۃ، مکۃ المکرمہ، ۱۴۰۱ھ

۳۳۔ سہ ماہی ایقاظ، مضمون 'سعودی عرب۔ تقارب ادیان کی راہ پر'، حامد کمال الدین، جنوری تا مارچ۲۰۰۹ئ،ص ۱۶۹

۳۴۔ وفاداری و بیزاری،ص ۲۵

۳۵۔ معجم المناھی اللفظیۃ،ص ۳۷۱

۳۶۔ حوالۂ سابق،ص ۵۲۰

۳۷۔ فتاوی علماء البلدالحرام،ص ۱۲۱

۳۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ستمبر ۲۰۱۱ء، ۱/ ۴۴۴

۳۹۔ سیوطی، جلال الدین، علامہ، الدر رالمنثور فی التفسیر بالما ثور، مرکز ھجر للبحوث والدراسات، القاھرۃ، ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ئ، ۳/ ۵۸۸۔

۴۰۔ تفہیم القرآن، ۱/ ۱۳۵۔

۴۱۔ محمد شفیع ،مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، فروری، ۲۰۰۶ء، ۵/ ۴۔۶

۴۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: مولانا مودودی، اسلامی ریاست، باب اول، بحث: رواداری کا غلط تصور اور اس کا جائزہ، اسلامک پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۸ئ،ص ۶۲۔۷۰

ابن فورک اور ان کی تصنیف 'مشکل الحدیث'

مطالعہ وجائزہ

حافظ نصیر احمد

نام ونسب

آپ کا پورا نام یوں بیان کیا گیا ہے:

"الأستاذ أبو بکر محمد بن الحسن بن فورک (بضم الفاء وفتح الرائ) الأصبهانی المتکلم صاحب التصانیف"[۱]

(استاذ ابو بکر محمد بن الحسن بن فورک (فاء کے پیش اور راء کی زبر کے ساتھ) اصبہانی۔ آپ متکلم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے)۔

آپ کی کنیت الانصاری بھی بیان کی گئی ہے۔ کسی مورخ نے آپ کی تاریخ ولادت ذکر نہیں کی، البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ عراق میں پیدا ہوئے۔[۲]

تعلیم وتربیت

آپ نے اوائلِ عمر میں ہی تحصیل علم کا آغاز کر دیا تھا۔ بصرہ اور عراق میں، جو اس وقت علوم وفنون کا مرکز تھے، آپ کی تعلیمی زندگی گزری۔ آپ نے نحو، ادب، فقہ، منطق، تفسیر اور اُصول وغیرہ میں گہری بصیرت حاصل کی۔ علم الکلام میں آپ امام ابوالحسن اشعری (م ۲۶۰ھ۔ ۳۳۱ھ) کے پیروکاروں میں شامل ہیں اور فقہی مسلک کے اعتبار سے آپ کا شمار فقہائے شافعیہ میں ہوتا ہے۔ تعلیمی مراحل سے فراغت پاتے ہی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کو ادب، اصول، وعظ، علمِ کلام،

تفسیر اور اسماء الرجال میں شہرت حاصل تھی۔ آپ ایک عابد وزاہد کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ ۳؎

مشہور اساتذہ اور تلامذہ:

ابن فورکؒ نے بصرہ اور عراق کے معروف اور اکابر علماء سے کسب فیض کیا ہے، جن میں سے چند مشہور درج ذیل ہیں:

۱۔ ابومحمد بن فارس

۲۔ عبداللہ بن جعفر

۳۔ ابوالحسن محمد بن محمد بن عبدالرحمن الباھلی

۴۔ ابن خرزا الاھوازی وغیرہ

آپ نے طویل عرصے تک عراق، رے اور نیشاپور وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، جن میں سے چند مشہور یہ ہیں:

۱۔ ابوبکر احمد بن حسین البیہقی (م ۴۵۸ھ)

۲۔ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)

۳۔ ابوالفتح محمد بن ابی القاسم القشیری

۴۔ ابوبکر احمد بن علی بن خلف وغیرہ۔ ۴؎

رے میں قیام کے دوران میں کچھ موقع پرست بدعتی لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے آپ کو اپنے غلط مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کی کوشش کی، جس پر نیشاپور کے علماء کی ایک جماعت نے آپ سے خط و کتابت شروع کی اور آپ کو نیشاپور آنے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آپ نیشاپور چلے گئے۔ وہاں لوگوں نے آپ کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کروایا اور آپ کو اس کا شیخ مقرر کر دیا۔ متلاشیان علم جوق در جوق سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے پاس اپنی علمی

پیاس بجھانے کے لیے جانے لگے۔ آپ ایک ماہر مناظر بھی تھے۔ کئی مسائل میں آپ نے مخالفین سے مناظرے کیے اور انہیں مات دی۔ اس دوران میں غزنہ سے تعلیمی دورے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر کئی درس دیے اور مناظرے کیے۔ واپسی پر راستے میں ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ ۵؎

سیرت و کردار

آپ ایک نیک مزاج، نرم خو، عابد و زاہد اور متقی انسان تھے۔ دینی کتب کا بہت زیادہ احترام کرتے اور طالبان دین کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جس گھر میں قرآن مجید ہوتا تھا، وہاں آپ تعظیماً سوتے نہیں تھے، بلکہ اس کے لیے کسی اور گھر میں چلے جاتے تھے۔ خشیت الٰہی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آخرت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔

ابو القاسم قشیری کہتے ہیں: ''میں نے ابو علی الدقاق سے سنا ہے کہ جب ابن فورکؒ بیمار ہوئے تو میں عیادت کرنے گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رو دیے اور کہنے لگے: ''یہ نہ سمجھنا کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں۔ میں تو موت کے بعد پیش آنے والے احوال سے ڈرتا ہوں''۔ ۶؎

علمی مقام و مرتبہ

آپ ایک بلند پایہ عالم تھے، جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امام حاکم نیشا پوریؒ اور امام بیہقیؒ جیسے نابغۂ روزگار افراد آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ کی علمی قابلیت کی بنا پر علماء نے آپ کو الاستاذ، الادیب، النحوی، الاصولی، المتکلم اور الواعظ جیسے القاب سے نوازا ہے۔ آپ کی بلند پایہ تصنیفات بھی آپ کے علمی مقام کا پتہ دیتی ہیں، خصوصاً علم کلام اور تفسیر میں آپ کو درک حاصل تھا۔ فقہ میں بھی کافی بصیرت رکھتے

تھے۔آپ کے علم و دانش کی بنا پر ہی آپ کو مختلف شہروں سے علمی دعوت نامے موصول ہوتے تھے۔ ۷؎

عبد الغافر بن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے ابو صالح المؤذن کو ان کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا:

”کان الأستاذ أحد وقته، ... یستسقی به و یستجاب الدعاء عنده“ ۸؎

(ابن فورک یگانۂ روزگار تھے...آپ کے ذریعے بارش کی دعا کی جاتی تھی اور آپ کے پاس دعائیں قبول ہوتی تھیں۔)

صاحب **الوافی بالوفیات** کہتے ہیں:

”کان رجلاً صالحاً، بلغت مصنفاته قریباً من مائة“ ۹؎

(ابن فورک نیک انسان تھے۔ان کی تصانیف ایک سو کے قریب ہیں)۔

تصانیف:

ابن فورکؒ نے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کے موضوع پر بلند پایہ کتب تصنیف کی ہیں۔ابن خلکان لکھتے ہیں:

”بلغت مصنفاته فی أصول الفقه و الدین و معانی القرآن قریباً من مائة مصنف“ ۱۰؎

(ابن فورک اصول فقہ، اصول دین و معانی القرآن کے موضوع پر تقریباً سو (۱۰۰) کتب کے مصنف ہیں۔)

آپ کی چند اہم تصنیفات درج ذیل ہیں:

۱۔ مشکل الحدیث و بیانه

۲۔ النظامی

۳۔حلّ الآیات المتشابهات

۴۔الحدود

۵۔غریب القرآن

۶۔رسالة فی علم التوحید

۷۔الاملاء فی الایضاح والکشف عن وجوه الأحادیث الواردة

۸۔دقائق الأسرار

۹۔شرح کتاب العلم والمتعلم لأبی حنیفہؒ

۱۰۔تفسیر القرآن ۱۱؎

وفات:

غزنہ سے واپسی پر آپ بیمار ہوئے اور نیشاپور پہنچنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔آپ کا انتقال ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء میں ہوا اور نیشاپور میں حیرہ کے مقام پر آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ ۱۲؎

مشکل الحدیث کا جائزہ

ابوبکر محمد بن حسن بن فورک اصبہانی، ادیب، نحوی، متکلم، اور اصولی ہونے کے ساتھ ایک بڑے محدث بھی تھے۔ الغرض وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ان کی ایک اہم تصنیف **مشکل الحدیث وبیانہ** کے نام سے ہے۔ ابن فورکؒ سے پہلے محدثین مختلف الحدیث اور مشکل الحدیث کو ایک ہی علم گردانتے تھے۔ انھوں نے خالصتاً علم مشکل الحدیث میں کتاب تصنیف کر کے ایک نئی سمت متعین کی۔ اس کتاب کی تدوین میں ابن فورکؒ نے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔کبھی وہ ایک محدث کی طرح اپنی سند سے حدیث بیان کرتے ہیں تو کبھی سند حدیث پر گفتگو کرتے ہیں۔کبھی ایک متکلم کی طرح بڑی شد و مد کے ساتھ کلامی بحث کرتے ہیں اور اس کی وضاحت کے لیے ادیبانہ انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی خطیبانہ انداز میں معتزلہ اور

دیگر فرق باطلہ پر چوٹ کرتے ہیں اور مسلک اہل سنت کی حقانیت ثابت کرتے ہیں۔ الغرض اس کتاب سے ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

کتاب کا نام، موضوع اور غرض وغایت

اس کتاب کے نام کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے۔اس کے تقریباً چودہ نام ملتے ہیں۔کسی نے اس کو مشکل الآثار ۱۳؎ کے نام سے تو کسی نے مشکل الحدیث وغریبہ ۱۴؎ کے نام سے اور کسی نے التاویلات کے نام سے ذکر کیا ہے۔۱۵؎ اختلافی بحث سے قطع نظر یہ کتاب 'مشکل الحدیث و بیانہ' کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں عالم الکتب بیروت سے بھی اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

کتاب کا موضوع نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ اور ان پر پیدا ہونے والے اشکالات کا حل ہے۔ ابن فورکؒ کے زمانے میں ملحدین و مشککین کی طرف سے ایسی احادیث پر طعن و تشنیع کیا جا رہا تھا جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان ہے۔ ان صفات کی بنا پر مشبہہ، معطلہ، مجسمہ، قدریہ، مفوضہ نام کے کئی گروہ پیدا ہو چکے تھے، جو ایسی احادیث کو بنیاد بنا کر، جن سے تشبیہ کا اشارہ ملتا ہے، دین میں طعنہ زنی کر رہے تھے۔ انہی اعتراضات اور اشکالات کا جواب دینے کے لیے ابن فورک نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور یہ کتاب تصنیف کی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> **أما بعد ۔۔۔فإني قد وُفِقت إلی إملاء کتاب نذکر فیه ما اشتهر من الأحادیث المرویة عن رسول الله ﷺ عما یوهم ظاهره التشبیه مما یتسلّق به الملحدون علی الطعن في الدین۔** (ص ۳۸)
>
> حمد و ثنا کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسی کتاب لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے جس میں ہم رسول اللہ ﷺ کی ان مشہور احادیث کا ذکر کریں گے جن کو بنیاد بنا کر ملحد قسم کے لوگ دین میں طعنہ زنی کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ابن فورکؒ کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ ایسی احادیث کا، جن میں صفات باری تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہو، اپنے فہم کے مطابق صحیح اور درست مفہوم واضح کریں، غیر اہل سنت متکلمین کے اعتراضات کا رد کریں، متکلمین کو انہی کی زبان اور انہی کے دلائل میں جواب دیں، مشبہہ کے فتنہ کو لگام دیں اور بدعتی لوگوں کی باتوں کا توڑ کریں، جو دین میں عیب جوئی اور طعنہ زنی کے راستے کھولتے ہیں۔

منہج کتاب

ابن قتیبہؒ نے جو کچھ اپنی کتاب 'تاویل مختلف الحدیث' میں لکھا ہے، ابن فورکؒ اس سے متاثر ہوئے ہیں، چنانچہ ابن قتیبہؒ کی کتاب میں جو احادیثِ تشبیہ وارد ہوئی ہیں، انہیں ابن فورک نے اپنی کتاب میں ذکر کر دیا ہے اور جو کچھ ابن قتیبہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے، اسے بھی نقل کر دیا ہے۔ ابن فورک نے اپنی کتاب کے آغاز میں ایک مختصر مگر پر مغز مقدمہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے اسماء وصفاتِ الٰہیہ کے بارے میں اپنے مسلک کی ترجمانی کی ہے اور کتاب لکھنے کا مقصد واضح کیا ہے۔ انھوں نے محدثین کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے: ایک گروہ نقل و روایت پر توجہ دیتا ہے، اسانید کی جانچ پرکھ، احادیث کے طرق کو جمع کرنا اور صحیح اور ضعیف میں فرق کرنا اس کا مشغلہ ہے، جب کہ دوسرے گروہ پر اجتہاد و استنباط کا غلبہ ہے اور وہ فروع کو اصول پر قیاس کر کے نئے نئے مسائل کا استنباط کرتا اور ان کے دلائل کو مرتب کرتا ہے۔ ابن فورکؒ ان دونوں گروہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> فالفرق الأولٰی للدین کالخزن للملک والفرق الأخری کالبطارق التی تذب عن خزائن الملک۔ (ص ۳۸)
>
> پہلے گروہ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کے خزانچی ہوں اور دوسرے گروہ کی مثال ان سپاہیوں کی سی ہے جو بادشاہ کے خزانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اس کے بعد ابن فورکؒ نے ان گروہوں کا ذکر کیا ہے جو دین میں بدعات رائج

کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں اوران کی وجہ سے اختلافات کو ہوا ملی ہے۔مختصر مقدمہ کے بعد کتاب کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ کتاب کا مرکزی موضوع 'مشکل الحدیث' ہے۔وہ مختلف الحدیث سے تعرض نہیں کرتے، بلکہ صرف وہی احادیث لاتے ہیں جن کا معنیٰ ومفہوم سمجھنے میں کوئی اشکال پیش آ رہا ہو، یا ظاہر میں وہ قرآن، اجماع اور قیاس وغیرہ سے متعارض دکھائی دیتی ہوں۔ وہ فقہی احکام والی احادیث کا بالکل ذکر نہیں کرتے، بلکہ صرف وہ احادیث بیان کرتے ہیں جن کا تعلق عقائد یا صفات الٰہیہ سے ہے۔

مسائل کو پیش کرنے میں ابن فورکؒ کا منہج یہ ہے کہ وہ پہلے اس طرح کا عنوان کرتے ہیں :**ذکر خبر مما یقتضی التأویل ویوھم ظاھرہ التشبیہ**۔ پھر اصل مسئلہ بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد **بیان تأویل ذلک** کا ذیلی عنوان قائم کر کے اس کے تحت آنے والی احادیث کا مفہوم واضح کرتے ہیں اوران کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اشکال کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ اشعری مسلک کی بھر پور حمایت کرتے ہیں اوراحادیث کے ظاہری معنی سے ہٹ کر تاویلات کی طرف جاتے ہیں۔اپنے موقف کی حمایت کے لیے وہ عربی لغت اور اشعار سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔ اگر اس حدیث کا کوئی مفہوم پہلے کے محدثین نے ایسا بیان کیا ہو جو ان کے موقف و مسلک سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس کا شدید رد کرتے ہیں۔مثلاً انہوں نے ابن قتیبہؒ اور ابن خزیمہؒ وغیرہ کا رد کیا ہے، جو صفات الٰہیہ کے معاملے میں تاویل کے بجائے ان کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہیں۔وہ ایسی احادیث پر طویل اور فلسفیانہ بحثیں کر کے منطق اور لغت کا سہارا لے کر ان کا ایسا مفہوم بیان کرتے ہیں جو اشاعرہ کے موقف کی تائید کرتا ہے۔

احادیث پر وارد ہونے والے اشکالات دور کرنے میں ابن فورکؒ اقتباسات کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، البتہ وہ حنفی فقیہ محمد بن شجاع الثلجی (۲۶۶ھ) کی آراء کثرت سے نقل کرتے ہیں۔کبھی کبھی بات کو مختصر کرتے ہوئے یوں بھی کہتے ہیں:

> **وأدلّة ھذا الباب و شرح وجوھہ ممّا قد ذکر فی الکتب، و لیس ھذا موضع ذکرھا۔** (ص ۲۰۰)

اس باب کے دلائل اور اس کے مختلف وجوہ کی شرح کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

بسا اوقات ابن فورکؒ احادیث کے اشکالات دور کرنے کے لیے ان کا سبب بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

> ”اس حدیث کا مفہوم اس بات سے بھی متعین ہوتا ہے کہ اس حدیث کا ایک خاص پس منظر ہے۔ وہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اپنے بیٹے یا غلام کے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تیرے چہرے کو برا بنائے۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کو مارے تو اس کے چہرے پر نہ مارے، کیوں کہ اللہ تعالی نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (ص ۳۸)

کتاب کی تقسیم

ابن فورک کی کتاب مشکل الحدیث و بیانہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

حصۂ اول: اس میں انہوں نے ایسی احادیث بیان کی ہیں جو ظاہری طور پر تشبیہ کا معنی دیتی ہیں۔ ان کا معنی و مفہوم انھوں نے اشعری مکتب فکر کے انداز پر واضح کیا ہے۔ اس حصے میں انہوں نے پچھتر (۷۵) سے زائد احادیث بیان کی ہیں اور محدثانہ انداز کے بجائے متکلمانہ طرز پر ان میں پیدا ہونے والے اشکالات پر گفتگو کی ہے۔ اس قسم میں انہوں نے جو احادیث ذکر کی ہیں ان میں سے چند مشہور یہ ہیں:

۱۔ میں (نبی کریم ﷺ) نے اپنے رب کو بہترین شکل وصورت میں دیکھا۔

۲۔ اللہ تعالی نے آدم کو مٹی کی ایک ایسی مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے مختلف جگہوں سے لی تھی۔

۳۔ حجر اسود اللہ تعالی کا دایاں ہاتھ ہے۔

۴۔ اللہ تعالی جہنم میں اپنا پاؤں رکھے گا۔

۵۔ اللہ تعالی ہنسے گا۔

۶۔اللہ تعالی نے فرشتوں کو اپنے بازوؤں کے بالوں سے پیدا کیا ہے۔
۷۔سعد بن معاذؓ کی موت سے رحمن کا عرش ہل گیا۔

حصۂ دوم: یہ حصہ ابن خزیمہ کی کتاب التوحید کے رد میں ہے۔اس کا آغاز ابن فورکؒ نے **فصل فیما ذکرہ ابن خزیمۃ فی کتاب التوحید** کے عنوان سے کیا ہے۔اس میں انہوں نے دس احادیث کا ذکر کر کے ابن خزیمہ کا رد کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ان احادیث کا معنیٰ و مفہوم بیان کرنے میں ابن خزیمہ راہِ صواب سے ہٹ گئے ہیں۔

حصۂ سوم : اس حصے میں انہوں نے شافعی فقیہ ابوبکر احمد بن اِسحاق الضبعی (۳۴۲ھ) کی کتاب الاسما والصفات کا رد کیا ہے۔اس میں انہوں نے بیس سے زائد فصلیں قائم کی ہیں، جن میں صفات الٰہیہ، مثلاً چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پنڈلی، قدم، کلام، استواء علی العرش کے موضوعات پر احادیث ذکر کی ہیں اور ان کے سلسلے میں شافعی فقیہ ضبعی کا رد کیا ہے۔

ابن فورکؒ کا منہج:

ابن فورک کے منہج کی وضاحت کے لیے ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِھتزّ عرش الرحمن لموت سعد بن معاذ۔[۱۷]

(سعد بن معاذؓ کی موت سے رحمن کا عرش ہل گیا۔)

ابن فورکؒ لکھتے ہیں: ”بعض اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہاں عرش کا حقیقی طور پر حرکت کرنا اور ہلنا مراد ہے۔ہم اس مفہوم کا انکار نہیں کرتے، کیوں کہ عرش کا ہلنا اور حرکت کرنا ممکن ہے، لیکن اس معنیٰ میں حدیث بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ عرش سے مراد وہ چارپائی ہے جس پر حضرت سعدؓ کو لٹایا گیا تھا۔اس معنی میں بھی حدیث کا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا

ہے، کیوں کہ اس حدیث میں حضرت سعدؓ کی فضیلت بیان ہو رہی ہے اور ان کی چار پائی کے ہلنے سے تو ان کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی ہے۔اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ یہاں اهتزاز سے مراد خوشی محسوس کرنا ہے۔عربی کا محاورہ ہے: اِنّ **فلاناًاذا دُعِیَ اِهتزّ و اذا سُئل اِرتزّ۔**

(فلاں آدمی کو جب دعوت دی جاتی ہے تو خوشی سے جھومتا ہے اور جب اس سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔)

یہ کلام ابو الاسودا لدولی کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اسے کھانے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے اور جب اس سے کوئی چیز مانگی جاتی ہے تو سکڑ جاتا ہے اور وہ چیز دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک شاعر کہتا ہے:

وتأخذه عندالمکاره هزة
کما اهتزّ تحت البارح الغضن الرطب

(مشکلات آنے پر وہ اس طرح جھومنے لگتا ہے جیسے تر و تازہ شاخ ہوا میں جھومتی ہے۔)

چنانچہ اس حدیث میں اهتزاز سے مراد خوشی اور سرور ہے اور عرش سے مراد رحمن کا عرش ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ عرش کو اٹھانے والے اور اس کے گرد گھومنے والے فرشتے اس بات پر خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے پاس سعد کی روح آ رہی ہے۔ چنانچہ یہاں پر عرش کو فرشتوں کا قائم مقام بنایا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ** (الدخان: ۲۹) ''نہ تو ان پر زمین روئی اور نہ آسمان۔'' یہاں زمین اور آسمان سے مراد اہل زمین اور اہل آسمان ہیں، جیسے نبی اکرم ﷺ نے احد پہاڑ کے بارے میں فرمایا تھا: **هذا جبل یحبنا و نحبه** (مسلم: ۱۳۶۵) ''یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔'' یعنی یہاں کے رہنے والے (انصار) ہم سے محبت کرتے ہیں اور ہم

ان سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ عرش کے حاملین فرشتے اس لیے خوش ہورہے ہیں کہ سعد بن معاذ کی روح ان کے پاس آرہی ہے اور یہ خوشی اس بنا پر ہے کہ حضرت سعدؓ کا مقام اللہ کے ہاں بہت بلند ہے۔(ص ۲۸۲۔ ۲۸۳)

۲۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنّ اللّٰہ تعالی لیستحی اذا رفع العبد الیہ یدیہ ان یر دّھما صفرًا من غیر شیی۔ ۱۸؎

(بے شک اللہ تعالی کو اس سے حیا آتی ہے کہ اپنے بندے کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو خالی لوٹائے)

حضرت یعلیٰ بن منیہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنّ اللّٰہ حَیِیّ سِتِیّر، فاذا أراد أحدکم أن یغتسل فلیتوارِ بشیی۔ ۱۹؎

(بے شک اللہ تعالیٰ حیادار اور پردہ پوشی کرنے والا ہے۔لہٰذا جب تم میں سے کوئی غسل کرے تو اسے چاہیے کہ کسی چیز سے خود کو ڈھانپ لے۔)

ابن فورکؒ ان حدیثوں کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جان لو کہ اللہ تعالی کو ایسی حیا سے موصوف کرنا جائز نہیں ہے جو مخلوق کی صفت ہے، کہ اس کی وجہ سے مخلوق میں انقباض ہوتا ہے اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے اور اگر حیا سے مراد چھوڑنا لیا جائے تو پھر صحیح ہے۔عرب کبھی کسی شی کے سبب کو اس شیی کے نام سے بھی موسوم کر دیتے ہیں۔اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ بندہ جب دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ ان ہاتھوں کو خیر سے خالی نہیں چھوڑتا۔اس طرح آپ کا یہ فرمان بھی اس معنی پر محمول کیا جائے گا: **اِنّ اللّٰہ لیستحی أن یعذّب المتورّع** (بے شک اللہ تعالی متورع شخص کو عذاب دینے سے حیا کرتا ہے۔) لوگوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ متورع کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا:''جو روز قیامت محاسبہ سے پہلے خود ہی اپنا محاسبہ کر لیتا ہے''۔اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو عذاب نہیں دیتا، بلکہ چھوڑ دیتا ہے۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلاً** ۔ البقرۃ: ۲۶۔ (بے شک اللہ تعالی اس بات سے کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ وہ مثال بیان کرے۔) اس آیت کا بھی یہی مطلب بیان کیا جائے گا کہ اللہ تعالی مثال بیان کرنا ترک نہیں کرتا۔ چنانچہ اللہ تعالی کا استحیا کسی چیز کو چھوڑ دینا ہے، کیوں کہ شرمانے والا حیا کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ جس طرح وہ ایمان کی وجہ سے گناہ چھوڑتا ہے اور حیا کی وجہ سے گناہوں سے باز آجاتا ہے ایسے ہی ایمان کی وجہ سے گناہ ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے آپؐ کا فرمان ہے: **الحیاء من الایمان** (بخاری: ۲۴، مسلم: ۳۶) ''حیا ایمان سے ہے۔'' اور ارشاد فرمایا: **إذا لم تستحی فاصنع ماشئت** (بخاری: ۳۴۸۳) ''جب تو حیا نہ کرے تو جو مرضی ہو وہ کر۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کسی دوسرے سے حیا نہ کرے تو گناہ اور برائی کا ارتکاب کرنے میں اس کو دین روکے گا نہ حیا۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے: **اِنّ اللّٰہ حَیِیّ سِتّیر** تو حیا کا معنی ہم بیان کر چکے ہیں اور **سِتّیر** بمعنی ساتر کے ہے، یعنی اللہ تعالی اپنے بندوں کے عیب چھپانے والا ہے، ان کو دوسرے انسانوں پر ظاہر نہیں کرتا۔ جس طرح قدیر بمعنی قادر اور علیم بمعنی عالم آتا ہے۔ جب ان حدیثوں کا وہ مطلب مراد لیا جائے گا جو ہم نے بیان کیا ہے تو مفہوم درست ٹھہرے گا اور جو لوگ ان میں تشبیہ کا دعوی کرتے ہیں ان کی بات مردود ہوگی۔'' (ص ۲۹۶)

مشکل الحدیث کے تراجمِ ابواب

علامہ ابن فورکؒ نے اپنی اس کتاب کو کسی فقہی یا اصولی ترتیب پر تالیف نہیں کیا ہے، بلکہ ایک متکلم کی حیثیت سے فِرَق باطلہ کی تردید سے کتاب کا آغاز کیا ہے۔ علمِ بیان کا ماہر ہونے کی وجہ سے مقدمۂ کتاب فصاحت و بلاغت کا غماز ہے اور تراجم ابواب کو بھی اسی نہج پر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پہلے وہ کسی موضوع پر حدیث یا آیت ذکر کرتے ہیں، پھر **'بیان تاویل ذلک'** کے ساتھ اس کا

معنیٰ بیان کرتے ہیں، پھر اس کی معارض حدیث یا قرآن کی آیت لاتے ہیں۔ اگرایک حدیث مختلف سندوں سے مروی ہوتو سب کو بیان کرتے ہیں۔ ذیل میں تراجم ابواب سے متعلق چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔کتاب کا آغاز انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق والی حدیث سے کیا ہےاور باب کا عنوان یوں قائم کیا ہے: **ذکر خبر مما یقتضی التأویل و یوھم ظاھرہ التشبیہ** (ص ۴۵) اس کے بعد عنوان کی وضاحت کر کے بغیر سند کے حدیث بیان کی ہے اور متنِ حدیث پر متکلمانہ نہج سے گفتگو کی ہے۔ اپنے مسلک کے مطابق اس کی تاویل کے لیے باب کا عنون '**بیان تاویل ذٰلک**'(ص ۴۸) کے الفاظ سے قائم کیا ہے۔حدیث پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد الگ فصل قائم کی ہےاوراس حدیث کی دیگر تاویلات ذکر کرنے کے بعد ان کا رد بھی کیا ہے۔ اس حدیث کے مضمون پر حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث کی تاویل ایک الگ فصل قائم کر کے ذکر کی ہے۔اس کے بعد اس معنی کی دیگر روایات ذکر کر کے ان پر جرح کی ہے۔آخر میں اسی بحث کو طول دیتے ہوئے دیگر عناوین قائم کیے ہیں۔

۲۔جہنم کے بھرنے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کا عنوان **ذکر خبر آخر مما یقتضی التأویل و یوھم ظاھرہ التشبیہ** (ص ۱۲۵) کے الفاظ سے کرتے ہیں اوراس سے متعلقہ بحث اپنے مسلک کے لحاظ سے کرتے ہیں۔

۳۔اللہ تعالی عزوجل کے تبسم فرمانے کے بارے میں حدیث باب **ذکر خبر آخر مما یقتضی التأویل و یوھم ظاھرہ التشبیہ** (ص ۱۳۶) کے الفاظ سے ذکر کی ہے۔ پھراس کی تاویل کے لیے **بیان تاویل ذٰلک** کا عنوان قائم کیا ہے۔(ص ۱۳۸)

۴۔ایسے ہی **ذکر خبر آخر مما یقتضی التأویل و یوھم ظاھرہ التشبیہ** (ص ۱۴۳) کے الفاظ سے باب باندھ کر تخلیقِ ملائکہ کے بارے میں اوراللہ تعالیٰ کے مکان، بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ کے خوش ہونے کے موضوعات کی احادیث کی تاویل پیش کی ہے۔

۵۔ ذکر خبر آخر مما یقتضی التاویل کا عنوان قائم کر کے اللہ تعالی کے حجابات میں ہونے (ص ۲۹۱)،اس کے آسمان میں ہونے (ص ۳۸۹)،موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالی کے کلام کرنے (ص ۴۰۲) اور اللہ تعالی کا ہاتھ ہونے (ص ۴۳۳) والی احادیث کی تاویل پیش کی ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ شذرات الذہب: ۵/ ۴۲۔

۲۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تاج الدین السبکی، ھجر للطباعۃ والنشر والتوزیع، طبع دوم، ۱۴۱۳ھ، ۵/ ۱۵۵۔ اکمال الکمال: ۴/ ۵۱۰۔ طبقات الفقہاء الشافعیہ: ۱/ ۱۳۶۔ وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۲۔ سیر أعلام النبلائ: ۱۷/ ۲۱۴۔۲۱۵۔ الوافی بالوفیات: ۲/ ۲۵۴۔ شذرات الذہب: ۵/ ۴۲۔

۳۔ معجم المؤلفین: ۹/ ۲۰۸۔ شذرات الذھب، ص: ۵/ ۴۲۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۵/ ۱۵۵۔ طبقات الشافعیہ، ابو بکر بن احمد بن محمد عمر بن قاضی شہبہ، عالم الکتب، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۴۰۷ھ، ۱/ ۱۹۰۔

۴۔ طبقات الشافعیۃ الکبری: ۵/ ۱۵۶۔ طبقات الشافعیۃ: ۱/ ۱۹۰۔۱۹۱۔

۵۔ طبقات الشافعیۃ الکبری: ۵/ ۱۵۶۔ وفیات الاعیان: ۳/ ۲۸۵۔

۶۔ طبقات الشافعیۃ الکبری: ۵/ ۱۵۶۔ وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۲۔

۷۔ معجم المؤلفین: ۹/ ۲۰۸۔ وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۲۔

۸۔ سیر اعلام النبلائ: ۱۷/ ۲۱۵۔ الوافی بالوفیات: ۲/ ۲۵۴۔

۹۔ الوافی بالوفیات: ۲/ ۲۵۴۔ وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۲۔

۱۰۔ الوافی بالوفیات: ۲/ ۲۵۴۔ تاج التراجم، ابو الفداء زین الدین قاسم بن قطلو بغا (المتوفی: ۸۷۹ھ)، دارالقلم دمشق، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ئ، ص: ۲۵۸۔

۱۱۔ فؤاد سزگین، تاریخ التراث العربی، جامعہ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، الریاض، ۱۹۸۳ھ: ۵۲/ ۴۔ معجم المؤلفین: ۹/ ۲۰۸۔ الاعلام للزرکلی: ۶/ ۸۳۔

۱۲۔ وفیات الاعیان: ۴/ ۲۷۲۔ الوافی بالوفیات: ۲/ ۲۵۴۔ الاعلام: ۶/ ۸۳۔

۱۳۔ معجم المولفین:۲۰۸/۹۔

۱۴۔ الاعلام: ۶/۸۳۔

۱۵۔ مجموع الفتاوی، تقی الدین ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ الحرانی (المتوفی: ۷۲۸ھ)، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ النبویۃ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۶ھ ۱۹۹۵/ ئ: ۲۳/۵۔

۱۶۔ مشکل الحدیث، ص ۴۸۔ یہ حدیث دیگر کتبِ حدیث میں بھی مروی ہے، ملاحظہ کیجیے، مسند احمد: ۷۴۲۰، ۸۱۲۵، ۹۶۰۴۔ مسند الحمیدی: ۱۱۵۴۔الاسماء والصفات للبیہقی: ۸۳۶، ۹۳۶۔سنن ابی داود: ۴۴۹۳۔ مسند ابی یعلیٰ، دار المامون للتراث: ۶۲۷۴۔

۱۷۔ بخاری: ۳۸۰۳،مسلم :۲۴۶۶

۱۸۔ ترمذی:۳۵۵۶، ابن ماجہ: ۳۸۶۵، ابوداود: ۱۴۸۸

۱۹۔ نسائی: ۴۰۷،مسند احمد: ۱۷۹۷۰

تعارف وتبصرہ

جمع و تدوینِ قرآن　　　ڈاکٹر حافظ محمد عبد القیوم

ناشر: الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ئ۔ صفحات: ۸۴
۳، قیمت۔/ ۵۰۰ روپے

علوم القرآن کا ایک مہتم بالشان موضوع 'جمع و تدوین قرآن' ہے۔ اس پر علوم القرآن کی قدیم یا جدید ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ مواد ضرور ملتا ہے۔ مستشرقین نے بھی خوب لکھا ہے اور عیسائی 'مبشرین' نے بھی۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے تدوین قرآن کی تاریخ، قراءات اور دیگر متعلقہ مباحث پر شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں۔ علماء اسلام نے اپنی تحقیقات میں ان کا بھرپور رد کیا ہے اور 'حفاظتِ قرآن' کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے، البتہ ان کے نقطۂ ہائے نظر میں کچھ فرق پایا جاتا ہے: بعض حضرات کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی تدوین عہد نبویؐ ہی میں مکمل ہو چکی تھی، جب کہ دیگر کا خیال ہے کہ عہد نبویؐ میں تمام قرآنی آیات تحریری شکل میں موجود تھیں، البتہ کتابی صورت میں ان کی تدوین حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں ہوئی، بعد میں حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں اس نسخۂ مدونہ کو تمام علاقوں میں بھیجا اور عام کیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب میں اس موضوع پر مبسوط مطالعہ کیا گیا ہے، اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور اختلافات کا محاکمہ کر کے مسئلے کی تنقیح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب تقدیم کے علاوہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ تقدیم کی حیثیت 'لٹریچر سروے' کی ہے کہ اس میں فاضل مصنف نے متعلقہ موضوع پر موجود تمام کتابوں، کتابچوں اور مقالات کا تعارف کرایا ہے۔ باب اول میں وحی کی کیفیتِ نزول، اس کی اقسام اور حفاظتِ قرآن کے مختلف طریقوں کا بیان ہے۔ باب دوم میں کتابت قرآن پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں اسلام سے قبل لکھنے پڑھنے کا رواج تھا۔ جن اشیاء پر تحریریں لکھی جاتی تھیں ان میں جلد (جانوروں کی کھال) نباتات، ہڈی اور پتھر سے بنی ہوئی مختلف اشیاء رائج تھیں۔ مصر سے درآمد 'ورق بردی' (Papyrus) بھی دست یاب تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے عہد میں قرآن مجید کی

کتابت کے لیے ان تمام چیزوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اگلے تین ابواب (سوم تا پنجم) میں عہد صدیقی میں تدوینِ قرآن کے محرکات وعوامل اور منہج کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے بتایا کہ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور آیات وسور کی قبولیت کے لیے حفظ کے ساتھ ان کے تحریری شکل میں موجود ہونے کو بھی لازم قرار دیا گیا۔ اس طرح تمام صحابہ کے اتفاق سے ایک 'نسخۂ ام' (Master copy) تیار کی گئی، جس کی طرف کسی اختلاف کی صورت میں رجوع کیا جا سکے۔ باب ششم میں قراءت (حفظ قرآن) اور کتابت کے باہم ربط وتعلق سے بحث کی گئی ہے۔ باب ہفتم 'عہد عثمانی میں صحف صدیقی کی ترویج' پر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عہد صدیقی میں ایک متفقہ نسخہ تیار ہو جانے کے باوجود اکابر صحابہ کے ذاتی نسخوں پر پابندی نہیں عائد کی گئی تھی اور قراءتوں کا اختلاف باقی تھا۔ عہد عثمانی میں سب کو ایک مصحف پر جمع کر دیا گیا۔ باب ہشتم میں نسخ قرآن اور قراءات کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور ان میں پائے جانے والے اختلافات کی تنقیح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب نہم میں مستشرقین اور باب دہم میں مسلم محققین کے اشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جمع وتدوین قرآن کے موضوع پر زیر نظر کتاب ایک عمدہ کاوش اور قابلِ قدر پیش کش ہے۔ فاضل مصنف نے تمام دست یاب مواد اپنے سامنے رکھا ہے اور روایات اور آراء کے درمیان اختلاف کی صورت میں عمدہ تنقیح کی ہے۔ کتاب میں عربی عبارتیں کثرت سے ہیں، ان کا ترجمہ بھی دے دیا جاتا تو بہتر تھا۔ کہیں کہیں مباحث کی تکرار بھی پائی جاتی ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

فقہی مقالات — مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

ناشر: مکتبہ اشرفیہ۔ ۳۶، محمد علی روڈ، ممبئی۔۳۔ سنہ اشاعت: ۲۰۱۷ء صفحات: ۵۸۰، قیمت۔/۳۰۰ روپے

انسانوں کی ہدایت ورہ نمائی کا ذریعہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ ہے۔ ہر شخص

کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہر مسئلے میں قرآن مجید اور سنت نبویؐ سے رہ نمائی حاصل کر سکے۔ اس لیے فقہاء نے کتاب وسنت کی تمام تعلیمات کو اس طرح جمع کر دیا ہے کہ ان سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے دور حاضر کے نئے پیدا شدہ مسائل کو اپنی حکمت وفراست سے کتاب وسنت کی روح اور منشا کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہر زمانے میں ایسے فقہاء اور علماء پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے اس فریضے کو بہ خوبی انجام دیا ہے اور امت کی رہ نمائی کی ہے۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی عظیم درس گاہ دار العلوم دیو بند کے فاضل ہیں، انھوں نے فقہ میں تخصص کیا ہے۔ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ فقہی موضوعات پر ان کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تقریباً اٹھارہ سال سے ہندوستان کی معروف درس گاہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں حدیث اور فقہ کی تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور جامعۃ الفلاح کی افتاء کمیٹی کے رکن ہیں۔

مشہور فقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی) مصنف کی فقہی بصیرت کے متعلق کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''ماشاء اللہ انھیں لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں ان کے مقالات قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور میرا یہ تجربہ ہے کہ وہ کسی مسئلے پر غور کرنے میں شارع کے نصوص، فقہاء کی تصریحات اور اپنے عہد کے مقتضیات، تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ شاید یہ ذوق ومزاج کی ہم آہنگی کی بات ہوگی کہ اس حقیر کی اور ان کی رائے کے درمیان خاصی ہم آہنگی پائی جاتی ہے''۔ (ص:۱۹)

زیر نظر کتاب مولانا محترم کے اکیس (۲۱) وقیع مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں عبادات، سماجی مسائل، معاشیات اور طب وعلاج کے متعلق موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ کچھ اہم مقالات کے عناوین یہ ہیں: غلے اور پھول کی زکوۃ، مشروط نکاح، کفاءت کی شرعی حیثیت، مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام، فیملی پلاننگ، حالت نشہ کی طلاق، تعاونی بیمہ، جوا اور جوا آمیز معاملات، غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات، اسلام

کا نظریۂ طب وعلاج، الکوہل کا استعمال، قتل بہ جذبۂ رحم، جہیز یا وراثت وغیرہ۔

اس کتاب کا ایک مقالہ 'مصارفِ زکوٰۃ' پر مشتمل ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مد 'عاملین' پر گفتگو کے دوران مدارس کے سفراء اور محصلین کے ذریعے چندہ کے موجودہ نظام کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں: ''وصولی زکوٰۃ اور چندہ کے موجودہ نظام کی کسی بھی حیثیت سے تائید نہیں کی جاسکتی کہ اس نے تو اس اجتماعی نظام کا تصور ہی مٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ سے علماء اور اہل مدارس کی جو بے وقعتی اور آپسی نزاع کی جو کیفیت ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے''۔ (ص ۳۸)

مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مد 'فی سبیل اللہ' ہے۔ اس کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور یہ ہر طرح کی نیکی کے کاموں کو شامل کرتا ہے۔ اس کا ایک مفہوم اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرنا ہے۔ بعض حضرات نے جہاد کے مفہوم میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ جہاد سے مراد صرف قتال نہیں، بلکہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے جو بھی کوششیں کی جائیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ مصنف نے 'فی سبیل اللہ' میں جہاد کے اس مفہوم کی تردید کی ہے۔ (ص ۷۱)

کتاب کے ایک اہم مقالے میں جوا اور جوا آمیز معاملات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے جوا کی حرمت اور اس کے معاشی و اخلاقی نقصانات بیان کیے ہیں اور اس کی مختلف شکلوں پر الگ الگ تفصیلی بحث کی ہے، جیسے انعامی مقابلے، تیر اندازی، نشانہ بازی، گھڑ دوڑ، معمہ، چوسر، شطرنج، کرکٹ، لوڈو، تاش، کبوتر بازی، پتنگ بازی، انشورنس اور لاٹری وغیرہ۔

فاضل مصنف نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہر مسئلے میں وہ سب سے پہلے قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے دلیل دیتے ہیں، اس موضوع پر ائمہ اور فقہائے سلف وخلف نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو بیان کرتے ہیں، فقہائے احناف کے علاوہ دیگر مسالک کے فقہاء کی رائے بھی نقل کرتے ہیں۔ اگر ان کی اپنی کوئی رائے ہے تو دلیل کے ساتھ اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مسائل کی توضیح

وتشریح اس طرح کرتے ہیں کہ ہر مسئلہ بالکل واضح اور نکھر کر آجاتا ہے اور سمجھنے میں کوئی پریشانی اور الجھن محسوس نہیں ہوتی۔

یہ مجموعۂ مقالات اہل علم کے علاوہ مدارس کے اساتذہ وطلبہ، اصحاب ذوق اور قانون داں حضرات کے لیے بھی مفید ہے۔ اس عمدہ کاوش پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (عبدالحی اثری)

الشعر العربی فی الھند الطاف احمد مالانی

ناشر: مرکز الملک عبداللہ بن عبدالعزیز الدولی لخدمۃ اللغۃ العربیۃ، ریاض، ۲۰۱۶ئ۔ صفحات: ۲۷۳، قیمت۔/۳۰۰ روپے

ہندوستان میں عربی زبان و ادب سے ربط وتعلق اور شغف کی قدیم تاریخ ہے۔ یہاں مختلف علوم وفنون اور خاص طور پر اسلامیات میں تصنیف وتالیف کے لیے عربی زبان کو واسطہ بنایا گیا ہے اور بڑی وقیع کتابیں لکھی گئی ہیں، جن کی قدر و قیمت کا اعتراف عالم عرب کے علماء و دانش وروں نے بھی کیا ہے۔ ہندوستانی علماء کا عربی ادب سے شغف اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے عربی زبان میں شاعری بھی کی۔ یوں تو ہندوستان میں عربی شاعری پر کئی حضرات نے تحقیقی کام کیا ہے، جن میں ڈاکٹر حامد علی خان کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان 'ہندوستان کی عربی شاعری' قابلِ ذکر ہے، جس پر موصوف کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وی محی الدین فاروقی نے 'کیرلہ میں عربی شاعری: آغاز وارتقائ' کے عنوان سے کالی کٹ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں تیرھویں چودھویں صدی ہجری میں ہندوستان میں عربی شاعری کو مطالعہ و جائزہ کا موضوع بنایا گیا۔ اس کا پورا نام یہ ہے: **'الشعر العربی فی الھند فی القرنین الثالث عشر و الرابع عشر الھجریین: أغراضہ و خصائصہ'**۔ اس کا امتیاز یہ ہے اول الذکر تحقیقی مقالات میں صرف شعراء کے تذکرے جمع کیے گئے ہیں اور ان کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں، جب کہ زیر نظر کتاب میں ان کا فنی حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔

جناب الطاف احمد مالانی نے جنوبی ہند کی مشہور دینی درس گاہ، دارالسلام عمر آباد سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس یونی ورسٹی سے، ادیب فاضل کا کورس کیا ہے، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی میں رہ کر تصنیفی تربیت حاصل کی ہے، پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے لیسانس (گریجویشن) اور ماجیستر (پوسٹ گریجویشن) کیا ہے، آخر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔زیر نظر کتاب اصلاً ان کا ماجیستر کا تحقیقی مقالہ ہے۔

یہ کتاب مقدمہ، تمہید اور خاتمہ کے علاوہ تین فصول پر مشتمل ہے۔ تمہید میں ہندوستان کے جغرافیہ، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں یہاں کے سیاسی حالات اور عربی زبان کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔فصل اول میں دونوں صدیوں میں یہاں کے شعراء اور ان کی شاعری پر اثر انداز ہونے والے اہم عوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔فصل دوم میں ہندوستان میں عربی شاعری کے موضوعات : اسلامی عقائد، زہد، مسلمانوں کی پستی پر اظہار افسوس اور اصلاحِ احوال کی دعوت، جہاد فی سبیل اللہ، نعت، حکم رانوں کی مدح، علمائ، اساتذہ اور عظیم شخصیات کی مدح، مرثیہ، غزل اور سیاسی، ثقافتی اور سماجی احوال کا بیان وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔فصل سوم میں، جو کتاب کا اہم ترین حصہ ہے، عربی شاعری کے ظاہری و باطنی فنی خصائص زیر بحث آئے ہیں۔

اس کتاب میں علامہ فیض الحسن سہارن پوری (م ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ئ) علامہ فضل حق خیر آبادی (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ئ) شیخ سید احمد قنوجی (م ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ئ) مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ئ) اور شیخ ابومحفوظ کریم معصومی (م ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ئ) کی عربی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔شعراء کی سوانح بیان کرتے ہوئے بہت سے مقامات پر صرف عیسوی سنین درج کیے گئے ہیں، جب کہ کتاب تیرھویں، چودھویں صدی ہجری کا احاطہ کرتی ہے۔مناسب تھا کہ ساتھ ہی ہجری سنین کا بھی ذکر کیا جاتا۔شیخ ابومحفوظ کریم معصومی کی سوانح میں انھیں 'باحیات' لکھا گیا ہے(ص۷۴)۔یہ بات مقالہ کی تحریر کے وقت کی ہوسکتی ہے۔ان کی وفات آٹھ سال قبل ہوچکی ہے۔مقالہ کی اشاعت کے وقت اس کی تصحیح ہوجانی چاہیے تھی۔

امید ہے کہ اس کتاب کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(م۔ر)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۶۳)

☆علمی حلقوں اور خاص کر ادارۂ تحقیق کے وابستگان کے لیے یہ خبر بہت رنج والم کا باعث ہوگی کہ مؤرخہ ۱۸ / فروری ۲۰۱۷ء کو سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی ایک سڑک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ وہ ادارہ کی مجلس منتظمہ میں شرکت کے لیے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی رکن مجلس منتظمہ ادارہ کے ساتھ بذریعہ کار علی گڑھ سے دہلی آرہے تھے کہ راستے میں اچانک ان کی کار ایک ٹرک سے ٹکرگئی۔ صفدر صاحب زخموں کی تاب نہ لاسکے، جب کہ ظفر الاسلام صاحب کو چوٹیں آئیں۔ علاج معالجہ کے بعد الحمد للہ اب وہ روبہ صحت ہیں۔ اللہ تعالیٰ صفدر صاحب کی خدمات کو قبول فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرکز جماعت سے مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت و صدر ادارہ، جناب نصرت علی، نائب امیر جماعت، ڈاکٹر محمد رفعت خازن ادارہ، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سکریٹری تصنیفی اکیڈمی اور دیگر حضرات نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور اہل خانہ سے تعزیت کی۔ ۲۳ / فروری کو ادارہ میں تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔

☆ ادارہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ۱۱ / مارچ، پھر ۲۹ / مارچ ۲۰۱۷ء کو منعقد ہوا۔ اس میں اہم فیصلے کیے گئے۔ جناب صدیق حسن، جناب محمد جعفر اور پروفیسر احمد سجاد کا استعفا مجلس منتظمہ کی رکنیت سے منظور کیا گیا۔ مولانا امین عثمانی، سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کو ادارہ کا تاسیسی رکن منتخب کیا گیا۔ مؤخر الذکر کو ادارہ کا سکریٹری بھی مقرر کیا گیا۔ ادارہ کے اسکالر جناب مجتبیٰ فاروق کو ادارہ کے شعبۂ علمی کا رکن منتخب کیا گیا۔

☆ مولانا سید جلال الدین عمری، صدر ادارہ کا ایک کتابچہ 'مسلم پرسنل لا کے بعض مسایل' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ اصلاً مولانا کے ان خطبوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مسجد اشاعت اسلام میں دیے تھے۔ ان میں اسلام کے عائلی قوانین: تعدد ازواج، طلاق، خلع وغیرہ پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور مسلم پرسنل لا کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ صفحات: ۳۲، قیمت -/۲۳ روپے۔

☆ مولانا عمری کی بعض اہم کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔'اسلام — انسانی حقوق کا پاسبان' عصری اہمیت کے حامل موضوع پر ان کی ایک اہم تالیف ہے۔اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد رفعت، خازن ادارۂ تحقیق نے کیا ہے، جو Islam The Bastion of Human Rights کے نام سے مرکزی مکتبہ سے شائع ہوا ہے۔ صفحات:۱۶۸، قیمت۔/ ۱۷۰ روپے۔اسلامی معاشرت پر مولانا کی اہم تصنیف 'اسلام کا عائلی نظام' کا انگریزی ترجمہ جناب پرویز منڈوی والا نے کیا ہے اور اس کی اشاعت Family Systam of The Islam کے نام سے مرکزی مکتبہ سے ہوئی ہے۔صفحات:۲۱۶، قیمت۔/ ۱۳۵/روپے ۔مولانا کے ایک کتابچہ 'قرآن کا نظامِ خاندان' کا تلگو ترجمہ جناب عبدالوحید نے کیا ہے اور اسے تیلگو اسلامک پبلی کیشنز ٹرسٹ حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔صفحات: ۲۴، قیمت۔/ ۳۰روپے۔

☆ جماعت اسلامی ہند کی مسلم پرسنل لا بیداری مہم (۲۳/ اپریل تا ۷/مئی ۲۰۱۷ئ) کے تحت ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی سکریٹری ادارہ نے ۳ تا ۷ /مئی راجستھان کا دورہ کیا، جہاں سوائی مادھو پور، سان گوڈ، کوٹہ، جودھ پور اور جے پور میں ان کے خطابات ہوئے۔

☆ مسلم پرسنل لا بیداری مہم کے تحت ۲۳ / اپریل ۲۰۱۷ء کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایک پروگرام منعقد ہوا، جس میں رکن ادارہ مولانا کمال اختر قاسمی نے 'طلاق مسئلہ نہیں، مسئلہ کا حل ہے' کے عنوان پر تقریر کی۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شاخ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ میں ۷ / مارچ ۲۰۱۷ء کو طلبہ کے سالانہ مقابلے ہوئے۔اس کے اختتامی پروگرام کی صدارت مولانا کمال اختر قاسمی نے کی اور 'مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار کون؟' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

☆ادارہ کے زیر تربیت اسکالرس کی انجمن 'رائٹرس فورم' کا پروگرام پروفیسر یوسف امین، شعبۂ علم الادویہ، طبیہ کالج ،مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ادارہ کے اسکالر جناب مجتبیٰ فاروق نے 'مریم جمیلہ کے چند افکار' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد شرکاء نے مباحثہ میں حصہ لیا۔ ☆☆☆

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 36 No.2

April - June 2017

Editor
Syed Jalaluddin Omari

Asstt. Editor
Muhammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur)، P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

Abstract of the Articles

The Family System of Islam - The Blessing Incarnate

Syed Jalaluddin Omari
President Idara -e-Tahqeeq-o- Tasneef-e- Islami
& Amir Jamaat-e-Islami Hind

Jamaat-e-Islami Hind launched a nationwide Muslim Personal Law Awareness campaign (23 April to 7 May 2017) to create awareness about Islamic Shari'ah among the Muslims. Praise be to A llah, this campaign left an abiding influence. During the campaign Ameer-e-Jamaat Maulana Syed Jalaluddin Umari delivered lectures in Hyderabad, Chennai, Kolkata,Patna and New Delhi. His lecture delivered in Chennai on 26 April is being presented here after review.

In this lecture the Maulana said Muslims, wherever they are, always have been acting upon the laws Islam has given for family system. Indian Muslims have been also continuously acting upon them. Among these laws is the law

of divorce (talaq). The Constitution of the country grants all minorities freedom to practise their respective religions. Now certain people are objecting to these rules and declaring them having been oppressive to women. The need is that Muslims act upon the Islamic family laws in a proper manner and also try to remove the misapprehensions about them. Likewise, the need is also to establish and strengthen the system of Islamic education for children so that Islamic teachings and values might be inculcated in their minds right from the very beginning.

Ahadith of Makkan Period in Seerah Ibn Ishaq [Part 2]

Prof. Muhammad Yasin Mazhar Siddiqui

Former Chairman, Dept. of Islamic Studies

Aligarh Muslim University, Aligarh

mnz_comp@yahoo.in

Muhammad Ibn Ishaq (d. 150 H.) holds the position of an authority in Seerah writing. Not only in his own age but also in every age he was considered the source of Seerah and he still is. The opinions of Muhadditthin, Ulama, Historians and Seerah writers about such a towering personality are almost negative and critical. In the field of Hadith he is not considered reliable and objections of sorts are levelled against him. In hadith narration he is called 'Mudallis'.

Ibn Hisham (d. 218 H.) compiled and precised the Seerah works of Ibn Ishaq. It gained popularity as Seerat Ibn Hisham. This book became so famous that the original book (of Ibn Ishaq) went in the background. In the Seerah narrations of Ibn Ishaq there are a large number of narrations which hold the position of Ahadith. This article presents a research and critical analysis of these Ahadith of Seerat Ibn Hisham and that too only those Ahadith which are related to the Makkan period of Prophet Muhammad (peace and blessings of Allah be to him).

This issue of the magazine presents the second part of this article.

Shari'ah Politics: Purport, Objective and Area of Operation

Maulana Muhammad Jarjees Kareemi
Member, Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh
jarjees.karimi@yahoo.com

One important book of Shaikh al-Islam Allama Ibn Taymiyyah is "Al Siyasat al-Shari'ah fi Islah al-Rai wa al-Raiyat". Therein he has explained and expounded Islamic politics in the light of the Qur'an and Hadith. This article presents a gist of that book.

Imam Ibn Taymiyyah has written that Allah the

Exalted has commanded that posts should be conferred only on those who deserve and have talents and potentialities to grace them. Then people are bound to obey them. It is the responsibility of the rulers to protect the treasury, and, having considered the wealth protected therein to be Amanah (Trust), spend it judiciously. It is also the responsibility of the rulers to implement Hudood (Islamic punishments), and in this regard never ignore it in view of some recommendation or bribery. It is very essential that peace prevails in the country; so it is also the duty of the rulers to crush rebels, dacoits and looters. It is necessary that the people obey the ruler and counter those who try to create disorder. Allah the Exalted has made rights and duties equally essential. Therefore it is indispensable that every person fulfil the rights of others quite willingly and cheerfully. The ruler should not employ his wilfulness and coercion but rather should keep on seeking advice from the enlightened and deem the governance as the Trust of Allah.

An Analysis of the Ideology of Unity of Religions (in the Light of Islamic Teachings)

Mrs. Rumaisa Maryam

Research Scholar, Uni. of Management & Science, Lahore

romesamariam@yahoo.com

Unity of Religions tends to mean that all religions, ideologies and sects existing in the world are true; the only

difference therein is of customs and traditions, otherwise all of them are the various branches of the one single tree. The beginning of this ideology can be traced to the emergence of Islam, while it emerged in its complete form in the 14th century Hijri. In the modern age various measures were taken for its spread. The basic motive lurking behind all these is enmity against Islam. The Islamic Shari'ah does not encourage any view or ideology which contradicts its fundamental principles. However, Islam, while sticking to its truth and veracity, deems it lawful to maintain relationship with other religions on the basis of respect.

Ibne Forak and his book 'Mushkil al-Hadith'

Hafiz Mohammad Naseer
Lecturer in Islamic Studies
Govt. M.A.O. College, Lahore
hafiznaseer6@gmail.com

Ibne Forak is one of the great Mohaddith as well as a great preceptor, writer, Syntactic and Dialectician of the 4th century Hijra. He is considered the originator of 'Ilme Mushkil al Hadith'. He, like a scholastic, compiled his book 'Mushkil al Hadith wa Bayanihi'. He harshly abrogated all interpretations that were counterview to 'Ahl al Sunna's Views'. His book is divided in three parts: in the first part Ibne Forak interpreted some Hadiths according to 'Ashari Maslak'. In the second part

he abrogated Ibne Khuzaima's book 'Al-Tawheed', and abrogated Ahmad bin Ishaq's book 'Al-Asma wa al-Sifaat' . In the third part he copied Ibne Qutaiba in abrogating counterviews.

BOOK REVIEWS

1. Jama wa Tadween-e- Quran (Compilation of Quran) Dr.Hafaz Muhammad Abdul QayyumAl-Faisal Nashiran - o - Tajiran - e - Kutub ,Lahore ,2016, Pages: 384; Price: PRs. 5oo/-
   Reviewed by Muhammad Raziul Islam Nadvi

2. Fiqhi Maqalat (Essays on Fiqh) Maulana Waliullah Majeed Qasimi, Maktaba Ashrafiya Mumbai; 2017; Pages: 580; Price IRs 300/-
   Reviewed by Abdul Hai Asari

3. Al-Sher al- Arabi fil Hind (Arabic Poetry in India) Altaf Ahmad Malani; King Abdullah bin Abdul Aziz Center for The Arabic Language,Riyadh , KSA, 2016; pages 372, Price not mentioned
   Reviewed by Muhammad Raziul Islam Nadvi

عشر وزکوٰۃ کی اہمیت وضرورت پر

ہماری اہم مطبوعات

فتاویٰ یوسف القرضاوی [اوّل] مجلد	علامہ یوسف القرضاوی	190.00
اللؤلؤ والمرجان [اوّل] مجلد	محمد فواد عبدالباقی	220.00
احکام ومسائل [اوّل] مجلد	مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ	110.00
عشروزکوٰۃ اور سود کے مسائل	مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ	48.00
تفہیم الاحادیث ہفتم [معاشیات، آداب اوردعا]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	290.00
خطبات [اردو] چہارم [حقیقت زکوٰۃ]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	22.00
خطبات [انگریزی] چہارم [زکوٰۃ]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	30.00
خطبات [ہندی] چہارم [زکوٰۃ کی حقیقت]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	24.00
تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث [مجلد]	مولانا سیّد جلال الدین عمری	100.00
انفاق فی سبیل اللہ	مولانا سیّد جلال الدین عمری	35.00
دولت میں خدا اور بندوں کا حق	مولانا سیّد جلال الدین عمری	16.00
زندگی کے عام فقہی مسائل [اوّل]	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	60.00
زندگی کے عام فقہی مسائل [دوم]	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	100.00
زندگی کے عام فقہی مسائل [سوم]	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	100.00
فقہ السنہ [مکمل] مجلد	مولانا محمد عاصم الحداد	250.00
فقہ اسلامی	مولانا محمد یوسف اصلاحی	105.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Phone: 26981652, 26984347

E-mail: mmipublishers@gmail.com • **Website:** www.mmipublishers.net

R.No. 38933/81

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

April ....2017 — June 2017

Mob. +91-8881854504
+91-9897746586

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۲۵/	۲۲	اوراق سیرت	۲۵۰/
۲	اسلام- انسانی حقوق کا پاسبان	۹۰/	۲۳	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/	۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵۰/	۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۶	خدا اور رسول کا تصور- اسلامی تعلیمات میں	۱۳۰/	۲۷	خدا کی غلامی- انسان کی معراج	۱۴/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/	۲۸	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۸	اسلام کی دعوت	۲۰۰/	۲۹	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/	۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۳۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۶/
۱۱	تہذیب و سیاست کی اسلامی قدریں	۶۵/	۳۲	انسانوں کی خدمت- اسلام کی نظر میں	۱۶/
۱۲	عورت- اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۳	جماعت اسلامی ہند- پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۳۵/
۱۳	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۵/
۱۴	عورت اور اسلام	۶۰/	۳۵	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۵	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۶	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۳۵/	۳۷	بچے اور اسلام	۱۰/
۱۷	قرآن کا نظام خاندان	۲۲/	۳۸	خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت	۲۰/
۱۸	اسلام- ایک دین دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت- اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت- اہمیت اور تقاضے	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۴/

ملنے کے پتے:
۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔ ۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵

Design By: Faiz Ahmad